۷۸۶

شعر العجم

حصہ دوم

خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک

مؤلفہ

مولانا شبلی نعمانی مرحوم

بفرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

روڈٹری پرنٹنگ ورکس لاہور میں باہتمام لالہ بھارام پروپرائٹر کے چھپا

۱۹۲۴ء قیمت ۸/ عہ

تعداد ۱۰۰۰

شعر العجم

حصّۂ دوم

ساتویں صدی ہجری تا ۹؁ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاعری بلکہ تمام اسلامی علوم و فنون کا جوش شباب تھا کہ دفعتہً تاتار کی طرف سے اس زور کا طوفان اُٹھا کہ دنیا کا شیرازہ بکھر گیا، یعنی ۶۱۶؁ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک بے چراغ کر دیا، کم و بیش چالیس لاکھ آدمی کا خون بہہ گیا، سینکڑوں ہزاروں شہر خاک سے برابر ہو گئے، مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اُڑ گیا، لیکن اسلام کچھ ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں پر بھی زندہ بچ گیا، بلکہ جونہی یہ طوفان تھمنا شروع ہوا، دبی ہوئی چنگاریاں پھر چمکیں، اور چمک کر اس طرح مشتعل ہوئیں کہ ایک دفعہ پھر ربع عالم تمام مطلع انوار ہو گیا،

چنگیز خاں ایک غارتگر کی شان سے اُٹھا تھا اور اپنی فوری اور سرسری انتظامات کیلئے اُس نے کچھ قاعدے بھی بنا لئے تھے جو تو رہ چنگیز خانی کے نام سے مشہور ہیں لیکن جب سلطنت کو استقلال ہوا تو شاہانہ نظم و نسق کی ضرورت پڑی، تاتاری لوٹ مار کے سوا اور کچھ جانتے نہ تھے اس لئے مسلمانوں سے اعانت لینے کے سوا چارہ نہ تھا، چنگیز خاں کے بعد اسکا بیٹا اوکتائی قاآن

اور اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو بن تولی، بن چنگیز خاں تخت نشین ہوا، ہلاکو نے خواجہ نصیر الدین محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا یہاں تک کہ اُس کا بیٹا نکودار، خواجہ شمس الدین محمد وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا اور اپنا نام احمد رکھا، ترک اس پر بگڑ گئے اور ارغون خاں (ہلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کر کے ۶۸۰ھ میں قتل کر دیا، لیکن جب ارغون کا بیٹا غازان خاں ۶۹۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا، اور اس کے ساتھ ساٹھ ہزار ترک مسلمان ہو گئے، غازان ۷۰۳ھ میں مر گیا، اس کے بعد اُس کا بھائی خدابندہ اور اُس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابوسعید بادشاہ ہوا، یہ تمام سلاطین نہایت عادل، انصاف پسند، مدبر اور دیندار تھے، اور بالخصوص سلطان ابوسعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین ... مساجد اور مدارس پر کندہ ہو کر مدتوں قائم رہے، یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے جو مشہور صوفی گزرے ہیں اپنی مثنوی جام جم میں ابوسعید کی اس طرح مدح سرائی کی ہے،

دو جہاں را صلائے عید زدند | سکہ بر نام بوسعید زدند
در چمن گفتہ بلبل و قمرے | مدح ایں گلبن اُد لو الامرے

سلطان ابوسعید نے ۷۳۶ھ میں وفات پائی، تمام مُلک نے اس کے مرنے کا ماتم کیا یہاں تک کہ مسجد کی میناروں پر ماتمی کپڑے لپیٹے گئے اور ہر شہر کی گلی کوچوں میں کئی کئی دن تک خاک اُڑتی رہی، چونکہ سلطان کے کوئی اولاد نہ تھی اس سے لئے ہر طرف سے سرداروں نے خود سری کی، آذربائجان، امیر چوبان و شیخ حسن جلایر نے دبا لیا، عراق اور فارس پر مظفر نے قبضہ کیا، غرض ۷۳۶ھ سے ۷۸۱ھ تک تمام قوتیں پریشان رہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے فرمانروا آپس میں لڑتے بھڑتے رہے، یہی زمانہ ہے جو تاریخ میں طوائف الملوکی کے

نام سے مشہور ہے[1]

بالآخر تیمور اُٹھا اور تمام دعویداروں کو مٹا کر شہنشاہی قائم کی اس کے خاندان میں حکومت کا جو سلسلہ قائم ہوا، اس کا خاتمہ سلاطین صفویہ کے آغاز سے جا کر ملتا ہے جہاں سے ہماری کتاب کا تیسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا واقعات میں ہمارے کام کی جو باتیں ہیں حسب ذیل ہیں،

۱۔ تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں، اس نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کو فنا کر دیا، اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئیں شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لئے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً

ہمای ہمایون خواجوی کرمانی، آئینۂ اسکندری امیر خسرو، سکندر نامہ جامی، تیمور نامہ ہاتفی، شاہنامہ قاسم گونابادی، اکبر نامہ فیضی، لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منہ چڑھاتے ہیں، دل میں کچھ نہیں، قوم اس قدر افسردہ ہو گئی تھی کہ ان کتابوں کے دو شعر بھی زبانوں پر نہ رہ سکے،

۲۔ عام قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا زیادہ یاد آتا ہے، اس لئے اس عہد میں تصوف کا زیادہ زور ہوا، عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی، سعدی، مغربی، انہی اسباب کے نتائج ہیں،

۳۔ جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا جو تصوف کے سوا، ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا یعنی غزل گوئی، یہ مسلم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اسکی ابتدا شیخ سعدی اور اُن کے معاصرین سے ہوئی، یہ اسی کا اثر ہے،

---

[1] یہ تمام حالات اول سے آخر تک مجالس المومنین اور دولت شاہی سے لئے گئے ہیں،

تاتار اور تیمور کی عام سفاکی نے قوموں کی قومیں غارت کر دیں، بڑے بڑے کج کلاہوں اور اورنگ نشینوں کا تاج و تخت خاک میں ملا دیا، خراسان سے لیکر شام تک زمین آسمان میں سناٹا ہو گیا ام الدنیا بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، تمام بڑے بڑے پائے تختوں میں خاک اُڑنے لگی، کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ آدمی ایک دم سے فنا ہو گئے، ان امور نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا تھا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے **شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ** کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے، ان لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا وہی زبان پر آیا اور پھر ایک روش قائم ہو گئی اور سب اسی انداز میں کہنے لگے۔

۴۔ ترک اور مغل بادشاہ اگرچہ اکثر نہایت مدبر اور عادل تھے اور اس لئے اُن کے عہد میں عام امن و امان رہا لیکن طبیعتوں میں شاعری کا مذاق نہ تھا، اس لئے دربار میں شعرا کی چنداں قدر نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے جو مشہور شعرا ہیں، مثلاً سعدی، خواجہ حافظ، مولنا روم، اوحدی، ابن یمین، کسی دربار سے خاص تعلق نہ رکھتے تھے، نہ سلطنت سے اُن کو کوئی خطاب حاصل تھا۔

۵۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں فی الجملہ آزادی کی روح آئی، سعدی اور ابن یمین کے قصائد اور قطعات میں جو خوشامد اور بیہودہ مداحی کی جا بجا عیب گیری پائی جاتی ہے وہ اسی کا اثر ہے،

۶۔ **تیموریہ** خاندان جو ایران میں قائم ہُوا، اُس کا خاتمہ **سلطان حسین مرزا** پر ہوا وہ عادل اور ہنر پرور ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا نہایت فریفتہ اور قدردان تھا، اس لئے اس کے عہد میں شاعری اس کثرت سے پھیلی کہ بچّہ بچّہ شاعر بن گیا **والہ داغستانی** **ریاض الشعرا** میں

لکھتے ہیں:

"در رعایت فضلا و شعرا سعی بلیغ فرمودہ است و در ترتیب شعرا آں قدر مبالغہ کردہ است کہ فن شاعری کہ فضیلت علوم را لازم داشت از علم جدا شد، و ہر بے مایہ بہ محض طبیعت موزون، ارادہ شاعری کرد رفتہ رفتہ فن شاعری کہ الطف فنون بود از درجۂ اعتبار افتادہ بہ مضحکہ انجامید"

سلطان حسین کا انجام صفویہ کے آغاز سے ملا ہوا ہے اس لئے صفویہ کے زمانہ میں دفعتہً جو ایران کے چپے چپے سے شعرا ابل پڑے، یہ وہی سلطان حسین کے ابر فیض کے رشحات تھے والہ داغستانی کو تو یہ رنج ہے کہ اس تعمیم کی وجہ سے ہر عامی شعر کہنے لگا اور علمی کمالات کی قید اٹھ گئی، لیکن ہمارے نزدیک، اسی بات نے شاعری کو شاعری کے رتبہ پر پہنچایا، بے شبہہ پہلے شعرا کے لئے علوم عربیہ اور معقول و منقول سے واقف ہونا ضرور ہوتا تھا، لیکن ان کمالات کے بوجھ میں اصلی جذبات دب کر رہ جاتے تھے، وقار و متانت، اور عوام کے معتقد علیہ ہونے کی وجہ سے اکثر جذبات اس آزادی سے ظاہر نہیں ہو سکتے تھے جس طرح دل میں آتے تھے یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین کی عشقیہ شاعری اس قدر اصلی جذبات سے لبریز ہے کہ قدما کے ہاں اس کا پتہ بھی نہیں لگ سکتا،

اس دور میں شاعری میں اصناف ذیل کو ترقی ہوئی:

تصوف، عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی، مغربی،

غزل، مولانا روم، شیخ سعدی، امیر خسرو، حسن، خواجہ حافظ،

اخلاق و موعظت، شیخ سعدی، ابن یمین،

قصیدہ گوئی، کمال اسمٰعیل، سلمان ساوجی،

قصیدہ گوئی میں، جو ترقی ہوئی اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) زبان زیادہ صاف ہو گئی اقدما کے دور میں ظہیر فاریابی نے زبان کو جس حد تک صاف کر دیا تھا وہ اس دور کی اخیر سرحد ہے کمال اسمٰعیل نے اور بھی زیادہ صاف کیا،

(۲) مضمون آفرینی میں بہت ترقی ہوئی، کمال نے ابتدا کی اور سلمان نے اس حد تک پہنچا دیا کہ متاخرین کی سرحد سے ڈانڈا مل گیا،

(۳) خاقانی، انوری وغیرہ جو علمی اصطلاحات سے کلام کو زیر بار کرتے تھے، یہ بات جاتی رہی، اس عہد کے قصائد ایک عامی کو بھی دیدیئے جائیں تو اصطلاحات وغیرہ کی بنا پر اس کو کہیں اٹکاؤ نہ ہوگا،

اب ہم اس دور کے مشہور شعراء کا حال لکھتے ہیں،

اس موقع پر اس قدر لکھ دینا ضرور ہے کہ اس دور کے ایک بڑے رکن شاعری یعنے مولٰنا روم کا تذکرہ ہم کو قلم انداز کرنا پڑا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے حالات اور انکی شاعری پر ایک مستقل کتاب، سوانح مولٰنا روم کے نام سے لکھ چکے ہیں، اور وہ گھر گھر پھیل چکی ہے،

در مکر بستنِ مضمونِ رنگین لطف نیست　　کم دہد رنگ ار کسے بندد حنائے بستہ را

خواجہ فریدالدین عطار

ولادت شعبان ۵۱۳ھ، وفات ۶۲۷ھ

اصلی نام محمد تھا، فریدالدین لقب ہے، نیشاپور کے اضلاع میں کدگن ایک گاؤں ہے
وہاں کے رہنے والے تھے، ان کے والد ابراہیم بن اسحاق، عطاری کا پیشہ کرتے تھے، اور
کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا، باپ کے مرنے کے بعد انھوں نے کارخانہ کو اور زیادہ رونق
دی، ریاض العارفین میں لکھا ہے کہ نیشاپور کے تمام کارخانے خواجہ صاحب کے اہتمام
میں تھے ارباب تذکرہ متفقاً لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب ایک دن دکان میں بیٹھے ہوئے تھے،
کسی طرف سے ایک فقیر آنکلا اور ان کی دکان کے ساز وسامان اور آرائش کو دیر تک غور سے
دیکھا کیا، خواجہ صاحب نے ناراض ہو کر کہا کیوں بیفائدہ اوقات ضائع کرتے ہو، اپنا راستہ
لو، اس نے کہا تم اپنی فکر کرو، میرا جانا کیا مشکل ہے، میں یہ چلا، یہ کہہ کر وہیں لیٹ گیا، خواجہ
صاحب نے اٹھ کر دیکھا تو تمام ہو چکا تھا، سخت متاثر ہوئے، کھڑے کھڑے دکان لٹوا دی،
اور سارا کاروبار چھوڑ کر فقیر ہو گئے،

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود خواجہ صاحب کی تصنیفات
نہیں پڑھیں، ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تصوف اور فقر کے کوچہ میں آنے کے
بعد بھی وہ اپنے قدیم پیشہ میں مشغول رہے اور اسی حالت میں اسرار اور عرفان کے حقائق پر
کتابیں لکھتے رہے، مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ جو ان کی قابل قدر تصنیفیں ہیں، اسی زمانہ کی
تصنیف ہیں، چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

مصیبت نامہ کاندوہ جہاں است   الٰہی نامہ کا سرار عیاں است

بہ دار وخانہ ہر دو کردم آغاز   چہ گویم، زود رستم زیں وآں باز

خواجہ صاحب کی تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عطار نہیں، بلکہ طبیب بھی تھے، اور بڑے زور شور کا مطب تھا، روزانہ پان سو آدمی ان کے مطب میں آتے تھے، خسرو نامہ میں لکھتے ہیں،

بہ دار وخانہ پانصد شخص بودند   کہ در ہر روز نبضم مے نمودند

میان آں ہمہ گفت وشنیدم   سخن را بہ ازیں روے ندیدم

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

بمن گفت اے بمعنی عالم افروز   چنیں مشغول طب گشتی شب و روز

سہ سال است ایں زماں تا لب بہ بستی   بر زہد خشک در کنجے نشستی

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب بچپن سے، درد آشنا تھے، اُن کے والد قطب الدین حیدر کے مرید تھے جو مشہور مجذوب گذرے ہیں اور ۵۹۷ھ تک زندہ تھے، جب کہ خواجہ صاحب کی عمر ۸ برس کی تھی، خواجہ صاحب نے بچپن ہی میں اُن سے فیض حاصل کیا تھا[۱] لیکن چونکہ اسلام رہبانیت کو گوارا نہیں کرتا اور اسی وجہ سے حضرات صوفیہ کو ان کے مجاہدات اور ریاضتیں مشاغل دینوی سے مانع نہیں آتیں، اس لئے خواجہ صاحب نے باوجود فقر اور تصوف کے عطار خانہ اور مطب کا تعلق قائم رکھا، اور متعدد کتابیں اسی حالت میں تصنیف کیں، یہ ممکن ہے کہ اخیر میں جب جذبۂ محبت زیادہ بڑھا تو خود بخود اور چیزوں سے دل اُچاٹ ہو گیا، اسی حالت میں فقیر کا واقعہ گذرا، اور اس نے آگ پر روغن کا کام دیا خواجہ

[۱] دولت شاہ،

صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اس عالم میں اُنہوں نے مدت تک سیاحی بھی کی، لسان الغیب میں لکھتے ہیں۔

چار اقلیم جہان گردیدہ ام

سر برآوردہ بہ محبوبے عشق	سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق
کوفہ ورے تا خراسان گشتہ ام	شیخ و جیحون ش رابریدہ ام
ملک ہندوستان و ترکستان زمین	رفتہ چوں اہل خطا از سوے چین
عاقبت کردم بہ نیشاپور جاے	اوفتاد از من بعالم ایں صداے
در نشاپورم بہ کنج خلوتے	باخداے خویش کردم وحدتے

خواجہ صاحب نے اگرچہ بہت سے بزرگوں سے فیض اُٹھایا تھا، لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہے خرقہ فقر مجد الدین بغدادی سے حاصل کیا تھا،

مجد الدین بغدادی، قطب الدین خوارزم شاہ کے مصاحب خاص تھے، جس زمانہ میں، چنگیز خاں دنیا کے مرقع کو زیر و زبر کر رہا تھا، خواجہ صاحب نیشاپور میں تھے، نیشاپور کی غارتگری میں ایک مغل نے خواجہ صاحب کو پکڑ کر قتل کر دینا چاہا، برابر سے ایک مغل بولا کہ ہزار روپے پر میرے ہاتھ بیچ ڈالو۔ خواجہ صاحب نے مغل سے کہا کہ اتنی قیمت پر کبھی نہ بیچنا میرے دام بہت زیادہ ہیں، ایک اور مغل آنکلا، اُس نے کہا اس غلام کو میرے ہات ایک توبڑہ گھانس کے معاوضہ میں فروخت کردو، خواجہ صاحب نے گرفتار کرنے والے سے کہا ضرور بیچڈالو میری قیمت اس سے کہیں کم ہے، خواجہ صاحب کی اس اختلاف بیانی کو وہ تمسخر سمجھا اور اُن کو قتل کر ڈالا، وہ اس نکتہ کو کیا سمجھ سکتا تھا، کہ واقعی انسان سے بڑھ کر کوئی چیز گراں

سلہ ریاض العارفین،

نہیں، اور نہ اُس سے بڑھ کر کوئی چیز ارزاں ہے، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین ۵

مغل نے خواجہ صاحب کو قتل کر دیا، لیکن خواجہ صاحب کا خون خالی نہیں جا سکتا تھا مغل کو ان کی عظمت کا حال معلوم ہوا تو توبہ کر کے اُن کے مزار کا مجاور ہو گیا اور مرتے دم تک جدا نہ ہوا[1]،

خواجہ صاحب کی تصنیفات

تصنیفات کی یہ تفصیل ہے، اسرار نامہ، آلہی نامہ، مصیبت نامہ، جوہر الذات، وصیت نامہ، منطق الطیر، بلبل نامہ، حیدر نامہ، گل و ہرمز، سیاہنامہ، شترنامہ، مختار نامہ، ان کے علاوہ غزلوں اور رباعیوں کا دیوان ہے، کل اشعار ایک لاکھ سے زیادہ ہیں، فقراء کا ایک تذکرہ لکھا ہے جو تذکرۃ الاولیا کے نام سے مشہور ہے، اور حال میں مسٹر براؤن نے اس کو شائع کیا ہے [illegible] عبد الوہاب قزوینی نے جو مسٹر براؤن کے شاگرد ہیں، ایک محققانہ دیباچہ لکھا جو صاحب کی [illegible] ہے،

کلام پر رائے

صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں، سنائی، اوحدی، مولانا روم، اور خواجہ فریدالدین عطار، خود مولانا روم باوجود ہمہ رنگی کے فرماتے ہیں، ع

ما از پس سنائی و عطار آمدیم،

ہفت شہر عشق را عطار گشت ۔۔۔ ماہماں اندر خم یک کوچہ ایم

خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کئے ہیں وہ حکیم سنائی سے زیادہ دقیق نہیں لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا اُن پر خاتمہ ہو گیا۔ ہر قسم کے خیالات اس بے تکلفی، روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا

[1] ریاض العارفین

نہیں ہو سکتے،

اس کے ساتھ قوت تخئیل بھی اعلےٰ درجہ کی ہے، بہت سے نئے مضامین پیدا کیے

ہیں، اور جو پہلے بندھ چکے تھے اُن کو ایسے نئے پہلو سے ادا کرتے ہیں کہ بالکل نیا مضمون

معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ مضمون کہ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد"،

سقراط، فارابی، بو علی سینا، الگ الگ طریقہ سے ادا کر چکے ہیں، تاہم خواجہ صاحب

نے اس کی بالکل صورت بدل دی، فرماتے ہیں،

عقل و حکمت تا شود گویا کسے — کاملے گفتہ است مے باید بسے

تا شود خاموش یک حکمت شناس — باز باید عقل بے حد و قیاس

یعنی ایک کامل کا قول ہے کہ بولنے اور تقریر کرنے کے لئے بہت عقل اور حکمت درکار ہے

لیکن چپ رہنے کے لئے اس سے بھی کہیں زیادہ عقل درکار ہے، مطلب یہ ہے کہ جب انسان

انتہائے درجۂ کمال تک پہنچتا ہے، تب جا کر یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں سمجھا اور اس بنا پر

چپ ہو جاتا ہے، اسی خیال کو ایک رباعی میں ادا کیا ہے،

اسرار ہمہ جہان توانی دیدن — مے پنداری کہ جان توانی دیدن

کوری خود آں زماں توانی دیدن — ہر گاہ کہ بینش تو گردد بکمال

وحدت وجود کا مضمون حد سے زیادہ پامال ہو چکا تھا، تاہم خواجہ صاحب کے پیرایے

نئے ہیں،

سوئے او ز ہرۂ اشارت نیست — پُر شد از دوست ہر دو کون ولیک

فغانی نے اسی مضمون کو اڑایا ہے،

آنا نمے توان کہ اشارت باو کنند — مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست

خواجہ صاحب کے اور مختلف طرز ادا دیکھو،

از برای غریب خود خود گشت — جلوہ در قدّ و در قدم رفتار

تاب در زلف، و وسمہ بر ابرو — سرمہ در چشم، و غازہ بر رخسار

رنگ در آب و آب در یاقوت — بوی در مشک، و مشک در تاتار

قم باذنی و قم باذن اللہ — ہر دو یک نغمہ آمد از لب یار

تو از دریا جدائی وین عجب بین — ز تو یک لحظہ این دریا جدا نیست

خواجہ صاحب کا جو فلسفہ ہے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا،

عبادت اور وحی کی حقیقت،

روزہ حفظ دل ست از خطرات — پس بود با مشاہدہ افطار

حج چہ باشد ز خود سفر کردن — بہ کجا؟ جانب ہدایت کار

وحی چہ بود ہر آنچہ در دل تو — سر زند از نتائج اسرار

انسان اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا،

قرب سی سال بود تا کہ ہمے کندم جان — کہ بجان راہ برم راہ نہ بردم بتنم

گرچہ بسیاری سن بازی فکرت کردہ ام — بیش ازیں چیزے نے دانم کہ در چنبرم

وصل تو گنجے است ہم پنہان ز خود — ہر کہ گوید یافتم دیوانہ ایست

بیگانہ شدم ز ہر دو عالم — وا گہ نہ کہ آشنای من کیست

چندیں در بستہ بے کلید ست چہ سود — کس نام کشادن نشنید ست چہ سود

پیراہن یوسف ست یک یک ذرات — یوسف ز میانہ ناپدید است چہ سود

نقشِ تو در خیال و خیال از تو بے بصر — نام تو بر زبان و زبان از تو بے خبر

در حقیقت گر قدم خواہی زدن — محو گردی تا کہ دم خواہی زدن

ہر آں مستے کہ بشناسد سر از پا — از دعوے مستی ناپسند است

گر در عشق از عشقت خبر نیست — ترا ایں عشق عشق سود مند است

عشق بستان و خویشتن بفروش — کہ نکوتر ازیں تجارت نیست

دریں دریا کہ من ہستم نہ من ہستم نہ دریا ہم — نداند ہیچ کس ایں سر، مگر آں کو چنیں باشد

تراد ر راہ یک، یکدم چو معراجیست سوئے حق — زیک یک پایہ برترے گزر چندانکہ بتوانی

گر ختم در بہشتِ نسیہ نتوانی رسیدن تو — ولے خود را ازیں دوزخ کہ نقد تست برہانی

اخیر شعر میں اُن لوگوں کے خیال کو رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بہشت کوئی چیز نہیں اُسکو اُدھار سمجھنا چاہئے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ مانا کہ بہشت اُدھار ہے لیکن یہ تو کرنا چاہئے کہ اس نقد دوزخ زتفکرات دینوی اسے نجات ہاتھ آئے،

تو چوں در بند صد چیزے خدا را بندہ چوں گردی — کہ تو در بند ہر چیزے کہ ہستی بندۂ آنی

عالمِ حقیقت، کفر و اسلام دونوں سے بالاتر ہے،

لب دریا ہمہ کفرست و دریا جملہ دینداری — ولیکن گوہر دریا ورائے کفر و دین باشد

انسان ہی میں سب کچھ ہے،

انچہ مے جویند بیروں دو عالم سالکان — خویش را یابند، چوں ایں پردہ از ہم بردرند

بہ ہمیں دیدہ بنگری ظاہر — صورت خویش را بصورت یار

ہر کہ ایں جا ندیدہ محروم ست — در قیامت ز لذتِ دیدار

انا لیلے بگو اگر مردی — ورنہ چوں ابلہان سرے مے خوار

وحدت وجود،

جہاں از نور پُر و تو در جہان نہ — ہمہ در تو گم و تو در میان نہ

خموشی تو از گویائی تست — نہانی تو از پیدائی تست

ترا با ذرّہ ذرّہ راہ بینم — دو عالم ثم وجہ اللہ بینم

دوئی را نیست رہ در حضرت تو — ہمہ عالم توئی و قدرت تو

نکو گوئے نکو گفتہ است در ذات — کہ التوحید اسقاط الاضافات

خدا را جز خدا ایک دوست کس نیست — کہ در خور و خدا ہم اوست کس نیست

دریں معنے کہ من گفتم شکے نیست — تو بے چشمے دو عالم جز یکے نیست

کمال اسمٰعیل خلّاق المعانی اصفہانی

وفات ۶۲۶ھ ہجری

اسمٰعیل نام، اور کمال تخلص تھا، ان کے والد جمال الدین عبدالرزاق مشہور شاعر تھے ان کا پورا دیوان آج موجود ہے، آتشکدہ میں ان کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، ان کے دو بیٹے تھے، عبدالکریم، اور اسمٰعیل، عبدالکریم فقیہ تھے، اسمٰعیل نے بھی مذہبی علوم حاصل کئے تھے، لیکن شاعری کا مذاق خاندانی تھا، اس لئے اسی طرف توجہ کی اور اسی میں کمال پیدا کیا، خاندان صاعدیہ[1] کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، جلال الدین خوارزم شاہ کی مدح میں بھی قصیدہ کہا ہے جو دیوان میں موجود ہے، لیکن درباروں میں چنداں قدر نہیں ہوئی، ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ خاندان صاعدیہ کی مدح کرتے ہیں اور سلاطین سے اعراض کرتے ہیں، بولے کہ صاعدیہ سخن فہم ہیں اُن سے داد سخن ملتی ہے اور میں اس کو صلہ سے بڑھ کر سمجھتا ہوں[2] تاہم چار ناچار، سلاطین کی مدح بھی کرتے تھے، بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ جب سلطان سنجر سلجوقی، گرجستان کو فتح کر کے اصفہان میں آیا تو کمال نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے،

حجاب ظلم تو برداشتی زچہرۂ عدل　　نقاب کفر تو بکشادی از رخ ایمان

---

[1] یہ کوئی شاہی خاندان نہ تھا بلکہ اصفہان کے قضاۃ میں تھے،

[2] بہارستان سخن از شاہ نواز خان مصنف مآثر الامراء

بالآخر افسردہ ہو کر ترک تعلقات کیا اور حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہات پر بیعت کی، دیوان میں ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں موجود ہے، ایک دفعہ کسی بات پر اہل وطن سے ناراض ہوئے، اور نظم میں بد دعا کی،

اے خداوند ہفت سیّارہ — بادشاہے فرست خونخوارہ
تا در دکوہ را چو دشت کند — جوے خون آورد زجو بارۂ[۱]
عدد مردمان بیفزاید — ہر یکے راکند بصد پارہ

۶۳۵ھ ہجری میں جب اوکتائے قاآن، اصفہان میں پہنچا تو قتل عام کا حکم دیا، اس زمانہ میں یہ گوشہ نشین ہو چکے تھے، اور شہر کے باہر ایک زاویہ میں رہتے تھے، چونکہ لوگ ان کا ادب کرتے تھے، اور ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا اس لئے اکثر لوگ نقدی وغیرہ ان کے گھر میں لا کر امانت کے طور پر رکھ دیتے تھے، گھر میں ایک کنواں تھا وہ ان امانتوں کا خزانہ بن گیا تھا، شہر کی غارت گری میں ایک ترک اس طرف نکل آیا، اور ایک پرند کو غلیل سے مارنا چاہا، اتفاق سے زہ گیر اڑ کر کنوئیں میں جا پڑی، ترک کنوئیں میں اُترا، زر و جواہر کا انبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، سمجھا کہ اور بھی خزانے گڑے ہونگے، کمال اسمٰعیل کو پکڑا کہ پتہ بتاؤ، اُنہوں نے لاعلمی ظاہر کی، اُس نے غصّہ میں آ کر ان کا خاتمہ کر دیا، مرتے وقت یہ رباعی کہی اور اپنے خون سے دیوار پر لکھی،[۲]

دل خون شد و شرط جانگدازی ایں است — در حضرت تو کمینہ بازی ایں است
با ایں ہمہ ہیچ دم نمے باید زد — شاید کہ ترا بندہ نوازی ایں است

[۱] اصفہان کے ایک محلہ کا نام ہے،

[۲] یہ تمام حالات آتشکدہ، اور دولت شاہ سے ماخوذ ہیں،

ریاض الشعرا میں ایک اور رباعی لکھی ہے، جو کمال نے اس حالت میں لکھی تھی، وہ یہ ہے،

این کشتہ نگر، کمال اسمعیل است | قربان شدنش نہ از رہ تخیل است
قربان تو شد کمال اندر رہ عشق | قربان شدن از کمال اسمعیل است

ید بیضا میں لکھا ہے کہ ترک کی انگوٹھی گر گئی تھی، اس کے نکالنے کے لئے وہ کنوئیں میں اُترا تھا، ید بیضا میں اس واقعہ کا سن ۶۲۶ لکھا ہے،

شاعری | کمال کی شاعری، قدما اور متاخرین کی مشترک سرحد ہے، یعنی اس کا ایک سرا قدماء اور دوسرا متاخرین سے ملا ہوا ہے، قدما کی متانت، پختگی، استواری اور متاخرین کی مضمون بندی، خیال آفرینی، نزاکت مضمون، دونوں یکجا جمع ہو گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین دونوں اُن کے معترف ہیں، خواجہ حافظ رح فرماتے ہیں،

گر بادرت نمی شود از بندہ ایں حدیث | از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم
گر برکنم دل از تو و بردارم از تو مہر | آں مہر بر کہ افگنم و دل کجا برم

عرفی کہتا ہے،

مراز نسبت ہمدردی کمال غم است | وگرنہ شعر چہ غم دار داز غلط خوانی

حزین کے زمانہ میں بحث پیدا ہوئی کہ کمال اور جمال میں سے کس کو ترجیح ہے، لوگوں نے حزین سے استفتا کیا، اس نے یہ جواب لکھا،

در شعر جمال ارچہ جمالے بکمال است | اما نہ بہ زیبائی افکار کمال است
لفظش بہ صفا آئینۂ شاہد معنے است | یعنے بہ شکوہے ست کہ طغرائے ہلال ست
صد بار، ز سرتا سر دیوانش گزشتم | لیلی ست کہ سرتا بقدم غنج و دلال ست

دریوزه گر رشحهٔ او بیند حریفان — الحق رگ ابر قلمش بحر نوالست

کمال اور محقق طوسی ہمعصر ہیں، کمال کی بلند پایگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی کہ محقق طوسی نے عظمت کے لہجہ میں کمال کا ذکر اپنی کتاب معیار الاشعار میں کیا ہے

کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱۔ بہت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے جن سے متاخرین کی مضمون آفرینیوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے. مثلاً،

چوں صبح باز کرد دہن را بوصف او — چرخش درست مغربی (اشرفی) اندر دہان نہاد

جب صبح نے بادشاہ کی تعریف میں مُنہ کھولا تو آسمان نے اس کے صلہ میں اس کے منہ میں اشرفی ڈالدی

افگند چار نعل ہلال، آسمان دو بار — تا بار کاب خواجہ عنان بر عنان نہاد

بیروں فگند چرم تراز و زبان زکام — از بسکہ بار جود برد بیکران نہاد

۲۔ نہایت مشکل طرحیں کرتے ہیں اور ان میں نئے نئے مضمون پیدا کرتے ہیں مثلاً

در گرد عزم او نرسد برق گرم رو — ورز آتشش بود بہ مثل چوں شرار پائے

از ہمت تو برآرم چو مور پر — از فرط عجز اگرچہ ندارم چو مار پائے

ترسم کہ چوں دراز شد ایں شعر ہیچکس — در گوش خویش جانہ دہد چوں ہزار پائے (کنکھجورا)

ایک بڑا اسیر حاصل قصیدہ لکھا ہے، جس کی ردیف برف ہے،

ہرگز کسے ندید بد نیسان نشان برف — گوئی کہ لقمہ ایست زمین، در دہان برف

مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ تعبیہ است — اجرام کوہ گشتہ نہان (پوشیدہ) در میان برف

۳۔ زبان کی صفائی اور سلاست کی حد جو ظہیر فاریابی پر ختم ہو چکی تھی، کمال نے

اس سرحد کو اور آگے بڑھایا، مثلاً

سپیدہ دم کہ نسیم بہار مے آید — نگاہ کردم و دیدم کہ یار مے آید

شراب در سر، و چہرہ ز شرم رنگ آمیز — چنیں میانۂ شرم و عقار مے آید

رخش چو شاخ درخت بہشت و ہر گل ازاں — کہ مے بچیدم، دیگر ببار مے آید

اُس کا چہرہ، بہشت کا درخت تھا کہ جو پھول میں چنتا تھا اُس کی جگہ دوسرا نکل آتا تھا،

زبسکہ داشت دل خستہ بستہ در فتراک — چناں نمود مرا کز شکار مے آید

گرفتمش ہمہ رہ در حدیث و او گہ گہ — بقدر حاجت، پاسخ گزار مے آید

میں نے اُسے باتوں میں لگایا اور وہ بھی کبھی کبھی بقدر ضرورت جواب دیتا جاتا تھا،

ہر آں فریب کہ از عشوہ بست در کارم — مرا ز سادہ دلے، استوار مے آید

مرا غرور کہ تشریف مے دہد، او خود — برائے خدمت صدر کبار مے آید

ایک قصیدہ میں ممدوح کی لیت و لعل کرنے کی شکایت ہے، ردیف ہیچ ہے اور کس روانی سے ہر جگہ ادا ہوتی ہے،

صدر را ز وام دار کز انعام خود مرا، — محروم ماندہ داری، و آں را بہانہ ہیچ

ہر روز بامداد کنم رُو بہ درگہت — یک دل پُر از امید و پس آنگہ شبانہ ہیچ

چندیں ہزار تیر معانی و شست طبع — کردم کشاد، و ماند از و بر نشانہ ہیچ

پنجاہ سال خدمت ایں خانہ کردہ ام — و امروز نیست ہمرہ من جز نسانہ ہیچ

گر مستحق ہیچ نیم من، بدیں ہنر — پس نیست مستحق عطا، در زمانہ ہیچ

از طالعست اینکہ من و آفتاب چرخ — مشہور عالمیم و برآں آستانہ ہیچ

زانم نمیدہی کہ ترا در خزانہ نیست — یعنی کریم را نبود در زمانہ ہیچ

برمنہج امید من، از وعدہا تے تو　　دامے است لبش شنگرف و دران دام دانہ ہیچ

آگے اور عنوانوں کے نیچے جو اشعار آئیں گے، ان میں صفائی زبان کی خصوصیت پر بھی لحاظ رکھنا چاہیئے،

۴. شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے لچوں کی زبان بن گئی تھی، کمال نے اس کو نہایت لطیف اور پرمزہ کر دیا، اگرچہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ بیہودہ صنف سرے سے اُڑا دی جاتی لیکن ہجو شعرا کا ایک بڑا آلہ تھا جس سے اُن کے معاش کو تعلق تھا، اس لیے وہ اس سے بالکل دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، امرا، سلاطین، جب صلہ کے دینے میں لیت و لعل کرتے تھے تو کمال* ہجو لکھی گئی ہے، ایک دفعہ گھوڑے کے زین و لگام، اور دانہ گھاس کے لئے ممدوح سے درخواست کی، دیکھو کس ظریفانہ پیرائے میں اس مطلب کو ادا کیا ہے،

دوش خربندہ کرد پیشم یاد　　کاسپک خواجہ، زندگی بتو داد
(سائیس)
تنگ دل گشتم از رہ خبرش　　کہ جوان بود و زیرک و استاد
گرچہ غمگین شدم ز واقعہ اش　　گشتم الحق ازاں یکے دلشاد
کہ شنیدم کہ او بہ وقت وفات　　بہ وصیت لب و دہان بکشاد
از جو و کاہ و از جل و افسار　　ہر چہ بُد، در وجوہ خیر نہاد
(گھاس، زین، لگام)　　(یعنی خیرات کیا)
در چناں وقت ایں چنیں توفیق　　بہمہ جا نور خدا بدہاد
وا جبم گشت تعزیت نامہ　　بتو اے سرور کریم نہاد
بر تو فرض است حق گزاری او　　زانکہ در خدمتت بسے استاد
مستحق تر ز اسپ من نبود　　گر وصیت ہمے کنی انفاد

جاری

* ہجو اور ظرافت سے کام لیتا تھا لیکن اس طرح کہ خود اس شخص کو مزہ آئے جس کی ہم

ہیچ تاخیر برنتابد خیر　　　زود تعجیل کن کہ خیرت باد

یعنی کل سائیس نے مجھ سے یہ خبر بیان کی کہ حضور کا گھوڑا، مر گیا، مجھ کو سخت رنج ہوا، لیکن اس خیال سے خوشی بھی ہوتی کہ اس نے مرتے وقت وصیت کی اور جو کچھ اس کے پاس سازوسامان تھا سب خیرات کردیا، ایسی توفیق خدا سب کو دے، بہرحال آپ پر اُس کا بڑا حق ہے، اور آپ کو اس کی وصیت پوری کرنی چاہئے، لیکن اس وصیت کا مستحق میرے گھوڑے سے بڑھ کر کوئی نہیں،

ایک بخیل کی ہجو کی ہے،

دوش مرا گفت دوستے کہ مرا　　　با فلاں خواجہ از پئے دو سہ کار
سخنے چند ہست راز پئے آں،　　　خلوتے مے بباید م ناچار
خلوتے آں چناں کہ اندر وے　　　ہیچ مخلوق را نباشد بار (گذرا)
گفتم ایں فرصت ار توانی یافت　　　وقت نان خوردنش نگہ مے دار (خیال رکھو)

یعنی مجھ سے کل ایک دوست نے کہا کہ فلاں رئیس سے مجھ کو کچھ مخفی کام ہے، اسلئے میں ایسی تنہائی کا موقع چاہتا ہوں، کہ اس وقت اُن کے پاس کوئی نہ ہو، میں نے کہا ایسا موقع صرف اُن کے کھانے کے وقت مل سکتا ہے

ایک اور بخیل کی ہجو میں لکھتے ہیں،

زمرد فانی باور کنم اگر گوید،　　　کہ من بخانۂ خود مے خورم طعام حلال
نہ آنکہ مال حلال است، مرد فانی را　　　کدام مال کہ او دارد و کدام حلال
ولے زممسکی آنگاہ مال خویش خورد　　　کہ اضطرار مرا اوراشود حرام حلال

یعنی فلاں شخص اگر کہے کہ میں اکل حلال کھاتا ہوں تو میں یقین کروں گا، لیکن نہ اس

بنا پر کہ درحقیقت اس کا مال پاک اور حلال ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ کھانا اتنی دیر کے بعد کھاتا ہے، جبکہ مردار بھی حلال ہو جاتا ہے (کم سے کم تین دن کے بعد)

ایک اور بخیل کی ہجو،

بدہن نان خواجہ چوں بردم — خواجہ گفتا کہ آہ من مردم
گفتمش خواہ میرو خواہ ممیر — کہ من ایں لقمہ را فرو بردم

کسی نے کمال کو بُرا کہا تھا، اس کے جواب میں کہتے ہیں،

شخصے بد ما بہ خلق مے گفت — ما از بداد سمے خراشیم
ما نیکی او بخلق گفتیم — تا ہر دو ادروغ گفتہ باشیم
(برا نہیں مانتے)

محقق طوسی کا یہ مشہور قطعہ،

نظامِ بے نظام ار کافرم خواند — چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمان خوانمش زیرا کہ نبود — سزاوارِ دروغے جز دروغے

اسی قطعہ سے ماخوذ ہے،

ایک رئیس سے صلہ کا تقاضا کیا ہے، اور کس قدر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے،

سہ شعر رسم بُوَد، شاعران طامع را[1] — یکے مدیح، دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ور نداد، ہجا — ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شعراء پہلے مدح کہتے ہیں، پھر صلہ کی یاددہانی کے لئے ایک نظم لکھتے ہیں اب اگر ممدوح نے صلہ عنایت کیا تو شکریہ لکھتے ہیں، ورنہ ہجو، میں ان تینوں نظموں سے دو لکھ چکا ہوں، تیسری کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے،

---

[1] یہ اشعار انوری کی طرف بھی منسوب ہیں،

غزل کی نسبت یہ مسلّم ہے کہ سب سے پہلا خاکہ کمال ہی نے قائم کیا ہے، جسکو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے، خان آرزو مجمع النفائس میں فغانی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں،

قدما را در غزل طرزے بسیار سادہ، چوں نوبت بہ کمال الدین اسمٰعیل رسید، او رنگے دیگر داد، بعد از و شیخ سعدی و خواجو نمکِ دیگر ریختند

کمال نے غزل میں سادگی اور صفائی کے ساتھ رنگینی اور جدت مضمون بھی پیدا کی جس کا اندازہ ان مثالوں سے ہوگا،

دوش بگذشتم و دشنام ہمیداد مرا — خدمتش کردم و پنداشت کہ من نشنیدم

کل میں اُدھر سے گذرا تو وہ مجھ کو گالیاں دے رہا تھا، میں نے اُسکو سلام کیا اور وہ سمجھا کہ میں نے گالیاں نہیں سنیں

گرچہ لعلش بہ سر ناخوشی آنہا میگفت — من ازاں خوشتر از و ہیچ سخن نشنیدم

اُس کے ہونٹھ اگرچہ بُری طرح گالیاں دے رہے تھے لیکن میں نے اس سے زیادہ خوش مزہ کوئی بات آجتک نہیں سنی

زمستان است اندازی ندارد چشم، کس ہرگز — مگر چشمش کہ چوں شد مست، ناوک بہتر اندازد

مست آدمی اچھی طرح تیراندازی نہیں کرسکتا، لیکن اس کی آنکھیں مستی میں اور زیادہ ٹھیک نشانہ لگاتی ہیں،

چو اندازد دہن تیرے، کنم در سینہ پنہانش — بداں تا از پئے ہر تیر تیرے دیگر اندازد

از چشم نیم خواب تو امروز روشن است — آں نالہ ہا کہ در غم تو دوش کردہ ایم

بود ہمیشہ جان من رسم تو بے گنہ کشی — ہیچ نہ کشتی مرا من چہ گناہ کردہ ام!

زبان کی سادگی دیکھو،

روئے زناں خوبتر تواند بود؟ — ہاں بگوئید اگر تواند بود

آنچناں نازک و چناں شیریں — لب نباشد، شکر تواند بود

دل خود طلب چو کردم برِ نرگس تو گفتا — بردائے فلان و بہمان، بر من چہ کار دارد
چو بسے بگفتم اورا بکرشمہ گفت با من — سر گفتگو ندارم، کہ مرا خمار دارد
چہ دہی صلاح مستان چہ کنی حدیث چیزے — کہ کمینہ ہندوے من بہ ازیں ہزار دارد

نخستم دل بدام اندر کشیدی — پس آنگاہم، قلم بر سر کشیدی
بقصد جان چو من، ناتوانی — ز روم و ہند و چیں لشکر کشیدی
پراگندہ ہمہ غمہاے عالم — ز بہر من، بہ یک دیگر کشیدی
اگرچہ آستین بر من فشاندی — دگر چہ دامن از من در کشیدی
نہ خواہد رفت از یادم کہ با من ق — شبے تا صبحدم ساغر کشیدی

رباعی

رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی، قدماء اور متوسطین میں اُس کی نظیر نہیں مل سکتی،

گل خواست کہ چوں رخش نکو باشد و نیست — چوں دلبر من برنگ و بو باشد و نیست
صد روے فراہم آورد در سالے — باشد (شاید) کہ یکے چو روے او باشد و نیست

گر لاف زنم کہ یار خوشخوست نہ — با ما بہ وفا و عہد نیکوست، نہ
زیں نادرہ تر کہ از براے تو مرا — شہرے ہمہ دشمن اند و تو دوست، نہ

در دیدۂ روزگار نم بایستے — یا با غم او صبر بہم بایستے
یا مایۂ غم چو عمر کم بایستے — یا عمر بہ اندازۂ غم بایستے

یار آمد و دوش گردش مہمانی — ہر چش گفتم نہ کرد، نافرمانی
مے خورد و بخفت و دست در رابستم — وانگاہ بہ او، چہ کردہ باشم دانی

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

مصلح الدین[1] لقب اور سعدی تخلص تھا، ان کے والد اتابک سعد بن زنگی بادشاہ شیراز کے ملازم تھے اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا[2]،

سال ولادت معلوم نہیں، وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی عمر کی مدت عام تذکروں میں ۱۰۲ برس کی لکھی ہے لیکن اس حساب سے سال ولادت ۵۸۹ھ ہوگا شیخ نے تصریح کی ہے کہ وہ ابوالفرح ابن جوزی کے شاگرد ہیں اور غالباً یہ وہ زمانہ ہوگا جب شیخ بغداد میں تحصیل علم کے لئے آئے ہیں، ابن جوزی نے ۵۹۷ھ میں وفات پائی، شیخ کی ولادت اگر ۵۸۹ھ میں مانی جائے تو ابن جوزی کی وفات تک اُن کی عمر کل ۹ برس کی ہوگی اور یہ کسی طرح صحیح نہیں، بعض تذکروں میں شیخ کی عمر ۱۲۰ برس لکھی ہے اگر یہ خارج از قیاس عمر تسلیم کرلی جائے تو اور واقعات کی کڑیاں مل جائیں گی لیکن ایک سخت دقت پھر باقی رہتی ہے وہ یہ کہ شیخ نے گلستان میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں سلطان محمود خوارزم شاہ نے خطا سے صلح کی میں کاشغر میں آیا"

سلطان محمود ۵۸۹ھ میں مرا ہے اس لئے اس زمانہ میں اُن کی عمر ۱۸ برس

---

[1] مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا، [2] تذکرۂ دولت شاہی،

کی ہوگی، لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شاعری اور کمالات نے کم از کم ۳۰۔۔۴۰ برس کی عمر میں شہرت پائی ہے، اس لئے یا تو شیخ نے غلطی سے علاء الدین تکمش خوارزم شاہ کے بجائے محمود خوارزم شاہ کا نام لکھ دیا ہے، یا اُن کی شاعری کی شہرت اُن کے شباب ہی میں ہو چکی ہوگی،

شیخ کے بچپن کے حالات اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے قلمبند نہیں کئے لیکن خود شیخ کے بیانات سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں،

شیخ کے والد نے شیخ کو جب پڑھنے کے لئے بٹھایا تو لکھنے کی تختی، کاغذ، اور ایک طلائی انگوٹھی خرید کر دی، یہ اُس وقت اس قدر کم سن تھے کہ کسی نے مٹھائی دیکر ان سے انگوٹھی اُڑالی، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

زعہد پدر یاد دارم بسے،	کہ باران رحمت برو ہردمے
کہ در طفلیم لوح و دفتر خرید	ز بہرم یکے خاتم زر خرید
بدر کرد ناگہ یکے مشتری	بشیرینی از دستم انگشتری

شیخ کے والد شیخ کو مزید محبت اور ترتیب کے خیال سے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے ایک دفعہ عیدگاہ میں ان کو ساتھ لے کر چلے، ہات میں دامن پکڑا دیا تھا کہ ساتھ سے الگ نہ ہو جائیں، راستہ میں بچے کھیل رہے تھے یہ دامن چھوڑ کر اُن میں جا ملے اور باپ کا ساتھ چھوٹ گیا، کشمکش اور ہجوم میں باپ کی صورت نظر نہ آئی تو گھبرا کر رونے لگے، اتفاق سے باپ نے دیکھ لیا، کان پکڑ کر کہا احمق! تجھ سے کہا نہ تھا کہ دامن نہ چھوڑنا، اس قسم کے واقعات ہر بچہ کو پیش آتے ہیں، لیکن اس سے یہ پاکیزہ نتیجہ نکالنا کہ

تو ہم طفل راہی بہ سعی اے فقیر	برو دامن پیر دانا بگیر

شیخ کا کام ہے۔

ان کے باپ ان کی تربیت اس طرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک مرید کو تزکیہ نفس کی منزلیں طے کراتا ہے، وہ بات بات پر اُن کو ٹوکتے تھے اوران کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے تھے، اُن کے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں زہد وعبادت کا چسکا پڑ گیا تھا، ایک دفعہ حسب معمول باپ کی صحبت میں رات بھر جاگے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے، گھر کے اور آدمی غافل سو رہے تھے، ان کو خیال آیا۔ باپ سے کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے بے خبر سو رہے ہیں کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اُٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لے، باپ نے کہا جان پدر! اگر تم بھی سو رہتے تو اس سے بہتر تھا کہ لوگوں کی غیبت کر رہے ہو،

بچپن میں جب ان کو وضو کرنا نہیں آتا تھا، محلہ کے ایک مولوی صاحب سے روزہ اور نماز سیکھنی شروع کی، مولوی صاحب نے وضو کے سب آداب وسُنن سکھا کر یہ بھی بتایا کہ روزہ میں دوپہر ڈھلنے کے بعد مسواک کرنا منع ہے، پھر کہا کہ ان فرائض کو مجھ سے بڑھکر کوئی شخص نہیں جانتا ہوگا، گاؤں کا رئیس بالکل بڈھا پھوس ہو گیا ہے، رئیس نے سُنا تو کہلا بھیجا کہ

نہ مسواک در روزہ گفتی خطا است — بنی آدم مردہ خوردن رواست

یعنی تم نے خود بتایا کہ روزہ میں مسواک کرنا منع ہے لیکن کیا مردہ کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) جائز ہے،

شیخ کے باپ نے اُن کے بچپن ہی میں وفات پائی اور جس ناز ونعم سے پل رہے تھے وہ سامان جاتے رہے، خود کہتے ہیں،

من آنگه سر تاجور داشتم | که سر در کنار پدر داشتم
اگر بر وجودم نشستے مگس | پریشان شدی خاطر چند کس
کنون دشمنان گر برندم اسیر | نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از درد طفلان خبر | که در طفلی از سر برفتم پدر

لیکن اُن کی والدہ ان کی جوانی تک زندہ رہیں اور ان سے بھی اُن کو اخلاقی سبق ملتے رہتے تھے، **گلستان** میں لکھا ہے،

وقتے از جہل جوانی بانگ بر مادر زدم، دل آزردہ بہ کنجے نشست وگریان ہمیگفت مگر خوردی را فراموش کردی کہ درشتی میکنی رباب ششم،

طالب علمی

شیراز میں اگرچہ تحصیل علم کا ہر قسم کا سامان مہیا تھا، سیکڑوں علما و فضلا درس و تدریس میں مشغول تھے، اس کے علاوہ اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی المتوفی سنہ ۵۹۱ھ[1] کا مدرسہ موجود تھا، لیکن اس زمانہ میں تحصیل کمال کے لئے ممالک دور دراز کا سفر اور مشہور درسگاہوں میں حاضر ہونا لازمی امر خیال کیا جاتا تھا، اس زمانہ میں سب سے بڑا مدرسہ جس کو یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں نظامیہ بغداد تھا، شیخ نے نظامیہ میں تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ عام طریقہ تھا مدرسہ سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا، یہ پتہ نہیں چلتا کہ نظامیہ میں اُنہوں نے کس سے تحصیل علم کی، ان قرائن سے کہ شیخ نے ابن جوزی کی شاگردی کی، ابن جوزی بغداد میں رہتے تھے، شیخ نظامیہ میں حدیث پڑھتے تھے، لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ نے نظامیہ میں ابن جوزی ہی کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا، لیکن مدرسین نظامیہ کی فہرست میں ہم ابن جوزی کا نام نہیں پاتے، بے شبہ ابن جوزی بغداد میں حدیث

[1] جامع التواریخ صفحہ ۲۰۰

کا درس دیتے تھے، لیکن اپنے مکان پر دیتے ہوں گے، نظامیہ سے اُن کا تعلق ثابت نہیں ہوتا،

یہ عجیب بات ہے کہ ابن جوزی کا اثر شیخ کی تعلیم پر نہیں پڑا، ابن جوزی ان محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں جو حدیث اور روایت میں نہایت سخت احتیاط سے کام لیتے تھے اور مشتبہ اور ضعیف روایتوں کو بالکل ترک کر دیتے تھے، لیکن شیخ اتفاق سے کہیں کوئی حدیث ذکر کرتے ہیں تو عموماً ضعیف بلکہ مصنوعی ہوتی ہے، مثلاً

سزد گر بدورش بنازم چناں   کہ سیّد بدوران نوشیروان

یا مثلاً لی مع اللہ وقت لا یسعہ ملک مقرب الخ

یا مثلاً حضرت ابوہریرہ کی حدیث زرنی غبا الخ

یا مثلاً طبیب فارس کی حدیث وغیرہ وغیرہ،

شیخ کی تحصیل علمی کا وہ زمانہ ہے جب اتابکانِ فارس کے سلسلہ میں سے سعد زنگی تخت حکومت پر متمکن تھا، وہ نہایت عادل اور صاحب جبروت حکمران تھا، لیکن معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ شیخ کو شیراز میں امن و آسایش سے رہنا نہیں نصیب ہو سکتا تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں،

سعدیا! حُبِّ وطن گرچہ حدیثیست صحیح   نتوان مرد بہ سختی کہ من آں جازادم

غرض شیخ نے تحصیل علم سے فارغ ہو کر، سیر و سیاحت شروع کی اور ایک مدّت دراز تک سفر کرتے رہے جس کی مدّت عام تذکرہ نویس ۳۰ برس لکھتے ہیں،

سفر و سیاحت

سیر و سیاحت کی غرض مختلف ہوتی ہے اور، جو غرض پیش نظر ہوتی ہے، سیاح اُسی حیثیت سے تمام چیزوں کو دیکھتا ہے بلکہ تمام چیزیں اُسی حیثیت سے خود اس کی نظر

ہیں جلوہ گر ہوتی ہیں، شیخ میں کثرت سے مختلف حیثیتیں جمع تھیں، وہ شاعر تھے، صوفی تھے، فقیہ تھے، واعظ تھے، حسن پرست تھے، رند تھے، شوخ طبع تھے، اس لئے اُنہوں نے تماشاگاہ عالم کو ہر ہر پہلو سے دیکھا،

وہ کبھی زہد و ریاضت کے عالم میں حج و زیارت کے لئے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں، نہایت دشوار گزار اور چٹیل صحراؤں میں پیادہ پا سینکڑوں کوس چلے جاتے ہیں، رات رات بھر کی متصل پیادہ روی سے تھک کر چور ہوجاتے ہیں اور عین راستہ میں پتھریلی زمین پر پڑ کر سو جاتے ہیں، کبھی نفس کشی کے لئے بیت المقدس میں کاندھے پر مشک رکھ کر سقائی کرتے ہیں، لوگوں کو پانی پلاتے پھرتے ہیں، کبھی کسی صاحبدل درویش کا تذکرہ سن کر اُس کی زیارت کے لئے روم پہنچتے ہیں، کبھی انبیا کے مزارات پر اعتکاف کرتے ہیں، جمعہ کا دن ہے نماز کو جانا چاہتے ہیں لیکن پاؤں میں جوتی نہیں، دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے، دفعتہً ایک شخص پر نظر پڑتی ہے، جس کے سرے سے پاؤں ہی نہیں، صبر آجاتا ہے اور سمجھ جاتے ہیں، کہ صبر و رضا کی تعلیم ہے،

ایک دفعہ لوگوں کی صحبت سے تنگ آکر بیت المقدس کے صحرا میں بادیہ نوردی شروع کی، اتفاق سے عیسائیوں نے پکڑ لیا اور طرابلس (ٹرپولی) میں خندق کھودنے کے کام پر لگا دیا، بہت پریشان ہوئے لیکن مجبور تھے، اتفاق سے ایک قدیم دوست کا اُدھر گزر ہوا، پوچھا خیر ہے؟ فرمایا،

همے گریختم از مردمان بکوه و بدشت | که از خدائے نبودم بدیگرے پرداخت
قیاس کن که چه حالت بود دریں ساعت | که با طویلهٔ نامردم بباید ساخت

یعنی جو شخص آدمیوں سے بھاگتا پھرتا تھا جب جانوروں میں پھنس جاتے تو

اس کی کیا حالت ہوگی، دوست کو رحم آیا، فدیہ دے کر اُن کو چھڑایا، اور اپنے ساتھ حلب میں لائے، مزید عنایت سے سو اشرفی مہر پر اپنی بیٹی کے ساتھ شادی کردی، لیکن صاحبزادی نہایت شوخ اور زبان دراز تھیں شیخ سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی، ایک دن کہنے لگیں تم اپنی ہستی بھول گئے، تم وہی تو ہو کہ میرے باپ نے دس دینار دیکر تم کو چھڑایا، شیخ نے کہا ہاں دس دینار دیکر چھڑایا، لیکن سو دینار کے عوض پھر گرفتار کرا دیا،

شیخ نے تصوف و سلوک کی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردی المتوفی ۶۳۰ھ سے حاصل کی، اسی سیاحت کی بدولت سفر دریا میں ان کا ساتھ ہوا اور ان کی فیض صحبت سے شیخ نے تزکیۂ نفس کے مراتب طے کیے، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

مرا پیر دانائے فرخ شہاب ‌‌ ‌ دو اندرز فرمود بر روے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بین مباش ‌ ‌ دگر آنکہ بر غیر بد بین مباش

ایک دفعہ بعلبک کی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید کا نکتہ بیان فرما رہے تھے، کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا تاہم یہ اپنے عالم میں مست تھے اور یہ شعر زبان پر تھا،

دوست نزدیک تر از من بہ من است ‌ ‌ ویں عجب تر کہ من از وے دورم
چکنم باکہ تواں گفت کہ او ‌ ‌ در کنار من و من مہجورم

اتفاق سے کوئی صاحب دل آ نکلے، اُنھوں نے بے ساختہ نعرہ مارا، اُن کے اثر سے مجلس کی مجلس گرما گئی، شیخ کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ " دوراں با بصر نزدیک و نزدیکاں بے بصر دور"، ایک دفعہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے قاضی کے دربار میں گئے اور اونچی صف میں جا کر بیٹھے، قاضی صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھا، اور امیر دربار نے جو

لوگوں کو حسب مدارج بٹھانے پر مامور تھا ان کے پاس آکر کہا،

ندانی کہ برتر مقام تو نیست　　　فروتر نشین، یا برو، یا بایست

بیچارے وہاں سے اُٹھ کر صف پائین میں آکر بیٹھے، تھوڑی دیر کے بعد حسب معمول کسی فقہی مسئلہ پر بحث چھڑی اور ہر طرف سے شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن کوئی شخص کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہتا تھا کہ سب اس کے سامنے سر جھکا دیں، شیخ کو اظہار کمال کا موقع ملا، صف پائین سے للکار کر کہا،

نہ رگہاے گردن بہ حجت قوی　　　کہ برہان قوی باید و معنوی

لوگوں نے اُن کی طرف توجہ کی، اُنھوں نے اس خوبی سے اس مسئلہ کو سلجھا کر ادا کیا کہ سب مان گئے، یہاں تک کہ خود قاضی صاحب صدر مجلس سے اُٹھے اور اپنی پگڑی اُتار کر اُن کے سر پر رکھ دی،

اُس زمانہ میں اتنا انصاف بھی تھا آج کا دن ہوتا تو کوئی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا،

اسکندریہ کے مشہور قحط میں جس میں لوگ بھوک کے مارے آدمی کو زندہ بھون کر کھا جاتے تھے، ایک دولت مند مخنث نے اپنا خوان کرم اس قدر وسیع کر رکھا تھا کہ کسی شخص کے لئے روک نہ تھی شیخ اس زمانہ میں اسکندریہ ہی میں تھے، اُن کے دوستوں نے ان سے کہا کہ مخنث کی دعوت میں چلنا چاہئے، اُن کی خودداری نے گوارا نہ کیا، اور کہا،

نہ خورد شیر، نیم خوردۂ سگ　　　ورز سختی بمیرد اندر غار

شیخ کی آزادہ روی اور تجرد کے لحاظ سے بظاہر قیاس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اہل

وعیال کا جھگڑا نہیں خریدا ہوگا، لیکن تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ انھوں نے اس تجربہ گاہ کی بھی سیر کی، ایکدفعہ تو وہی مجبوری کا تعلق اختیار کرنا پڑا تھا جس کا ذکر اوپر گذر چکا، دوسری دفعہ صنعاء (یمن کا صدر مقام) میں نکاح کا اتفاق ہوا، اور اس سے اولاد ہوئی، لیکن بچپن ہی میں جاتی رہی، باوجود آزادی کے شیخ کو اس کا بہت صدمہ ہوا چنانچہ خود بوستان میں فرماتے ہیں،

بہ صنعا درم طفلے اندر گذشت   چہ گویم کزانم چہ بر سر گذشت

یہاں تک حواس باختہ ہوئے کہ قبر کا ایک تختہ اکھاڑ کر لخت جگر کو دیکھنا چاہا، لیکن ہولناک منظر دیکھ کر کانپ اٹھے، اور غشی سی طاری ہوگئی، ہوش میں آئے تو فرزند دلبند نے زبان حال سے کہا،

شب گور خواہی منوّر چو روز   ازینجا چراغ عمل بر فروز

جس زمانہ میں سلطان خوارزم شاہ نے خطا والوں سے صلح کر لی، شیخ کاشغر میں آئے جامع مسجد میں ایک مدرسہ تھا جس میں حسب دستور عربیات کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، سیر کرتے کرتے مدرسہ میں آئے، ایک خوش جمال لڑکا زمخشری کی کتاب (غالباً مفصّل ہوگی) پڑھ رہا تھا اور یہ فقرہ زبان پر تھا ضرب زید عمرا شیخ نے کہا خوارزم و خطا میں صلح ہوگئی اور زید اور عمر کا جھگڑا اب تک ختم نہیں ہو چکا، لڑکا ہنس پڑا اور اُن کا نام ونشان پوچھا، انھوں نے کہا شیراز شیخ کا شہرہ عالم گیر ہو چکا تھا، شیراز کا نام سنکر اس نے کہا سعدی کے شعر بھی کچھ آپ کو یاد ہیں؟ انھوں نے عربی کے دو شعر اسی وقت موزون کرکے پڑھے، لڑکا سمجھ نہ سکا، بولا کہ ہمارے ملک میں تو اُن کے فارسی شعر مشہور ہیں، آپ فارسی شعر پڑھتے تو میں سمجھ بھی سکتا، شیخ نے برجستہ کہا،

اے دل عشاق بدام تو صید　　ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

دوسرے دن کسی نے لڑکے سے کہدیا کہ یہی سعدی ہیں، وہ دوڑا ہوا شیخ کے پاس گیا اور نہایت اخلاص و عقیدت ظاہر کی، اور کہا کہ آپ نے نام کیوں نہیں ظاہر فرمایا کہ میں خدمت گذاری کی سعادت حاصل کر سکتا، شیخ نے جواب دیا ع باوجودت زمن آواز نیامد کہ منم (تیرے سامنے میں یہ نہ کہہ سکا کہ میں ہوں) لڑکے نے عرض کی کہ چند روز آپ کا قیام ہوتا تو سب آپ سے مستفید ہوتے، شیخ نے کہا نہیں میں نہیں ٹھہر سکتا پھر یہ اشعار پڑھے،

بزرگے دیدم اندر کوہسارے　　قناعت کردہ از دنیا بہ غارے

بدو گفتم بہ شہر اندر نیائی؟　　کہ بارے بندے از دل بر کشائی

بگفت آنجا پری رویان نغز اند　　چو گل بسیار شد پیلان بلغزند

وقت کی تہذیب دیکھو! شیخ جیسا مقدس اور صوفی منش، ایک امرد کو گلے لگاتا ہے، پیار کرتا ہے منہ چومتا ہے اور پھر دیدہ دلیری سے کہتا ہے،

ایں بگفتیم و بوسہ چند بر سر و روے یکدیگر دادیم و وداع کردیم،

بوسہ دادن بروے یار چہ سود　　ہم دراں لحظہ کردنش پدرود

اسی عالم سیاحت میں شیخ ہندوستان میں بھی آئے، عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ امیر خسرو سے ملے تھے، لیکن مستند تاریخوں میں اسی قدر ہے کہ امیر خسرو کے ممدوح خان شہید[1] نے دو دفعہ شیخ کو شیراز سے طلب کیا، لیکن شیخ نے بڑھاپے اور ضعف کا عذر کیا اور گلستان و بوستان اپنے ہاتھ سے لکھ کر تحفہ میں بھیجی،

[1] خان شہید نے ۶۸۳ھ میں شہادت پائی اور شیخ سعدی کے بلانے کا واقعہ اسی سنہ کو دو چار برس قبل کا واقعہ ہے،

خان شہید نے امیر خسرو کا کلام بھی بھیجا تھا، شیخ نے اس کی بہت تحسین کی اور لکھا کہ یہ جوہر قابل قدر دانی کے قابل ہے،

ہندوستان کے سفر کا ایک واقعہ شیخ نے بوستان میں لکھا ہے لیکن بیان واقعہ میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ مشتبہ ہوجاتا ہے، اُن کا بیان ہے کہ وہ سومنات میں آئے، یہاں ایک عظیم الشان بت خانہ تھا، پوجاریوں سے راہ و رسم پیدا کی، ایک دن ایک برہمن سے کہا کہ مجھ کو سخت تعجب ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں وہ نہایت برہم ہوا اور تمام بت خانہ میں یہ چرچا پھیل گیا، سب ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، انہوں نے کہا بت کے ظاہری حسن و خوبی کا میں بھی معترف ہوں لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے؟ برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے، میں نے بھی بہت سفر کئے اور ہزاروں بت دیکھے لیکن جو معجزہ اس میں ہے کسی میں نہیں، یہ ہر روز صبح کو دعا کے لئے خود ہات اُٹھاتا ہے، چنانچہ دوسرے دن شیخ نے شعبدہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے؟ تقیۃً بت کے ہات چومے اور بہت خشوع و خضوع ظاہر کیا اور بت خانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پوجاری مندر میں رہا کرتے ہیں، برہمنوں کو جب اُن کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو ایک دن بت خانہ کا پھاٹک بند کر کے چاروں طرف نظر دوڑائی، دیکھا تو بت کی پشت کی طرف ایک مغرّق پردہ ہے، پردہ کی اوٹ میں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے، جس کے ہاتھ میں ایک رسی ہے، رسی میں بت کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، انداز سے یہ شخص رسی کو کھینچتا ہے تو ہاتھ اُٹھ جاتے ہیں، اُن کو دیکھ کر وہ شخص بھاگا، اُنہوں نے تعاقب کر کے اس کو کوئیں میں دھکیل دیا اور خود بھاگ نکلے،

ان واقعات کے بیان میں عام غلطیاں تو یہ ہیں کہ بت کو ہاتھی دانت کا بتایا ہے حالانکہ ہاتھی دانت کو ہندو پاک نہیں سمجھتے اس لئے اس کا بُت نہیں بنا سکتے، برہمنوں کو لکھا ہے کہ وہ پاژند پڑھتے تھے،

فتادند گبران پاژند خوان   چو سگ با من از بہر آں استخوان

حالانکہ پاژند ہندوؤں کی کتاب نہیں بلکہ پارسیوں کا صحیفہ ہے،

برہمنوں کو کہیں گبر اور کہیں مطران کہتے ہیں،

پس پردہ مطران آذر پرست،

حالانکہ مطران عیسائیوں کے پادری کو کہتے ہیں، پھر مطران کو آذر پرست کہنا اور بھی لغویت ہے ان جزئیات کے سوا اصلی واقعہ بھی نہایت دور از قیاس ہے شیخ کتنی ہی بت پرستی کرتے لیکن یہ نا ممکن تھا کہ ایک ایسے عظیم الشان بت خانہ میں تمام برہمن اور پجاری اکیلے انکے ہات میں بُت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جاتے اور اُن کو یہ موقع ملتا کہ چاروں طرف کے دروازے بند کر کے جو چاہتے کرتے،

حقیقت یہ ہے کہ یہ تازہ ولایت تھے خدا جانے کس چیز کو کیا سمجھے اور کس واقعہ کو کیونکر لکھ گئے۔ اکثر انگریز سیاحوں کا یہی حال ہے دو چار دن ہندوستان میں رہ کر سفر نامے لکھتے ہیں جن کو پڑھ کر ہندوستانیوں کو غور کرنا پڑتا ہے کہ یہ کس ملک کی داستان ہے شیخ نے اس حکایت کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ سومنات سے میں ہندوستان میں آیا، غالباً اس زمانہ میں ہندوستان خاص دہلی اور نواح دہلی کو کہتے ہوں گے، لیکن شیخ نے کچھ زیادہ تصریح نہیں کی اور نہ کہیں سے پتہ لگتا ہے کہ کہاں تک پہنچے تھے،

شیخ نے جب سیاحت شروع کی تو فارس میں اتابکان سلغری کی حکومت تھی، یہ

سلسلہ بھی اور سلسلوں کی طرح سلجوقیوں کا دست پرور دتھا، اس سلسلہ کا پانچواں حکمران سعدزنگی شیخ سعدی کا ہمعصر تھا لیکن اُس کے اخیر زمانہ تک سعدی وطن میں نہیں آئے صاف نہیں کھلتا کہ اس کے اسباب کیا تھے، لیکن شیخ کی بعض تلمیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو اس زمانہ میں امن وامان کی طرف سے اطمینان نہ تھا، سعدزنگی نے ۶۲۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا اتابک ابوبکر بن سعدزنگی تخت نشین ہُوا، وہ نہایت شان وشوکت کا بادشاہ تھا، فارس کی حکومت جو دو سو برس سے تاراج گاہ بن رہی تھی اس کے زمانہ میں عروس رعنا بن گئی، ہر طرف نظم ونسق قایم ہوگیا، جابجا مدرسے اور درسگاہیں کھل گئیں، علما، وفضلا وشعرا دور دور سے کھنچ آئے، شیخ ہمیشہ وطن کے شوق میں بیتاب رہتے تھے، اور وطن پہنچنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں،

چہ خوش سپیدہ دمے باشد آنکہ بینم باز — رسیدہ بر سر اللہ اکبر[1] شیراز

نہ لایق ظلمات ست بااللہ ایں اقلیم — کہ تخت گاہ سلیمان بدست حضرت راز

اب جو امن وامان کی طرف سے اطمینان ہوا تو شام سے عراق عجم ہو کر شیراز میں آئے چنانچہ ایک قطعہ میں غریب الوطنی اور مراجعت کی وجہ تبصریح لکھی ہے،

ایک قطعہ میں اس سے بھی زیادہ صاف لکھا ہے،

ندانی کہ من در اقالیم غربت — چرا روزگارے بکردم درنگی

بروں رفتم از تنگ ترکان کہ دیدم — جہاں درہم افتادہ چوں موئے زنگی
(کشمکش)

ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن — چو گرگاں بہ خونخوارگی تیز چنگی

چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم — پلنگان رہا کردہ خوئے پلنگی

---

[1] اللہ اکبر، شیراز کے ایک چشمہ کا نام ہے،

چناں بود در عہد اوّل کہ دیدم　　جہاں پُر ز آشوب و تشویش و تنگی

چنیں شد در ایام سلطان عادل　　اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

شیراز پہنچکر شاہی تعلقات سے بالکل آزاد رہنا تو ممکن نہ تھا، ابوبکر بن سعد زنگی کے درباریوں میں داخل ہوئے، مدحیہ قصاید لکھے، گلستان اور بوستان اسی کے نام سے معنون کی، غالباً صلے بھی (بلا طلب) ملے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آزاد مزاجی کی وجہ سے دربار کے قابل نہ تھے، اور ابوبکر بن سعد نے اس وجہ سے ان کی چنداں قدر دانی نہیں کی، چنانچہ ایک قصیدہ میں ہلکی سی شکایت بھی کی ہے،

بر دولتت ہمہ افتادگان بلند شدند　　چو آفتاب کہ بر آسمان برد شبنم

مگر کمینۂ آحاد بندگان سعدی　　کہ سعیش از ہمہ بیش است و حظش از ہمہ کم

انکیانو جوابا قاآن خاں (پسر ہلاکو خاں) کی طرف سے خاندان اتابک کے انقراض کے بعد شیراز کا گورنر مقرر ہوا تھا، اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں،

سعدیا چندانکہ میدانی بگو　　حق نباید گفتن الّا آشکار

ہر کرا خوف طمع در بار نیست　　از خطا باکش نباشد وز تتار

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایشیائی درباروں میں کیونکر فروغ پا سکتے تھے غرض ابوبکر بن سعد نے تو ان کے رتبہ کے موافق ان کا احترام نہ کیا لیکن جو امرا خود صاحب علم و فضل تھے وہ شیخ کی پرستش کرتے تھے،

اس زمانہ میں علم و فضل کے اصلی پشت و پناہ شمس الدین صاحب دیوان اور علاء الدین تھے،

خواجہ شمس الدین، ہلاکو خاں کا وزیر اعظم تھا، اور ہلاکو خاں کے زمانہ میں باوجود اختلاف مذہب اور تاتاریوں کی سفاکی کے اسلام کا جو نام ونشان رہ گیا وہ صرف خواجہ شمس الدین کا صدقہ تھا، تاتاریوں میں جو اسلام پھیلا وہ بھی خواجہ شمس الدین ہی کی بدولت تھا سب سے پہلے اس سلسلہ میں نکودار (ہلاکو خاں کا بیٹا) اسلام لایا اور سلطان احمد کے لقب سے ملقب ہوا، نکودار نے خواجہ شمس الدین ہی کی ہدایت اور ترغیب کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا،

خواجہ شمس الدین کا دوسرا بھائی علاؤ الدین، ہلاکو خاں کی طرف سے بغداد کا حاکم تھا اور نہایت صاحب فضل وکمال تھا، تاتاریوں کی سب سے مفصل اور مستند تاریخ جہانکشا اسی کی تصنیف ہے،

یہ دونوں بھائی شیخ سعدی کے مرید اور معتقد خاص تھے، شیخ ایک دفعہ جب حج سے واپس آکر تبریز میں آئے جو ہلاکو خاں کا پایہ تخت تھا تو خواجہ شمس الدین سے ملنے گئے، اتفاق یہ کہ اُدھر سے اباقاآن خاں (پسر ہلاکو خاں) کی سواری آرہی تھی، خواجہ شمس الدین اور علاء الدین بھی ساتھ تھے، شیخ نے اس خیال سے کہ تعارف کا یہ موقع نہیں، چاہا کہ نظر بچاکر نکل جائیں اتفاق سے دونوں بھائیوں نے ان کو دیکھ لیا، گھوڑوں سے اتر پڑے اور جاکر شیخ کے ہاتھ پاؤں چومے، اباقاآن خاں دیکھ رہا تھا، اس کو سخت حیرت ہوئی کہ برسوں سے یہ میرے دربار میں ہیں اور نمک خوار ہیں تاہم جو تعظیم اُنھوں نے اس بوڑھے کی کی، میری بھی کبھی نہیں کی۔ جب دونوں بھائی شیخ سے رخصت ہوکر جلوس میں شامل ہوئے تو اباقاآن نے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا؟ جس کی تم نے اس قدر تعظیم وتکریم کی، اُنھوں نے کہا یہ ہمارا باپ تھا، اباقاآن نے کہا تمہارا باپ تو مرچکا ہے، بولے کہ پدر طریقت ہے، حضور نے سعدی کا

نام سُنا ہوگا جن کا نظم و نثر آج تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے وہ یہی بزرگ ہیں اباقاآن ملنے کا مشتاق ہوا، دوسرے دن دونوں بھائی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کا پیغام کہا، شیخ نے انکار کیا لیکن ان لوگوں نے اس قدر اصرار کیا کہ شیخ کو چار ناچار جانا پڑا، اباقاآن سے دیر تک صحبت رہی، چلتے چلتے اس نے کہا کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرماتے جائیے، شیخ نے کہا مرنے کے بعد صرف اعمال ساتھ جائیں گے، اب تم کو اختیار ہے کہ اچھے اعمال ساتھ لے جاؤ یا بُرے، اباقاآن نے کہا اس مضمون کو نظم کر دیجیے، شیخ نے برجستہ کہا،

شہے کہ حفظ رعیت نگاہ مے دارد — حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی است

دگر نہ راعی خلق است زہر مارش باد — کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی است

اباقاآن کے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور کہا کہ میں راعی ہوں، یا نہیں؟ شیخ نے کہا اگر راعی ہو تو پہلا شعر حسب حال ہے ورنہ دوسرا، اباقاآن بار بار پوچھتا تھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ لیکن شیخ ہر بار وہی شرطیہ جواب دیتے رہے، چلتے ہوئے شیخ نے یہ اشعار پڑھے

بادشہ سایۂ خدا باشد — سایہ با ذات آشنا باشد

نشود نفل عامہ قابل خیر — گر نہ شمشیر بادشا باشد

ملکت او صلاح نپذیرد — گر ہمہ رائے او خطا باشد

ہر صلاحے کہ در جہان آید — اثر عدل بادشا باشد

اباقاآن پر ان اشعار کا نہایت اثر ہوا،

ایک دفعہ خواجہ شمس الدین نے چند سوالات لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے اسکے ساتھ ایک عمامہ اور پانچسو اشرفیاں بھی بھیجیں، لیکن قاصد نے ڈیڑھ سو اشرفیاں خود اُڑا لیں

شیخ نے سوالات کے جواب کے ساتھ اشرفیوں کی رسید بھی لکھی اور عجیب لطیف طریقہ سے نوکر کی خیانت ظاہر کی،

چونکہ تشریفم فرستادی وبال	مالت افزون باد و خصمت پائمال
ہر بہ دیناریت سالے عمر باد	تا بمانی سی صد و پنجاہ سال

یعنے آپ کو خدا ہر اشرفی کے بدلے ایک برس عمر دے تاکہ آپ ۳۵۰ برس زندہ رہیں

خواجہ شمس الدین نے نوکر سے بازپرس کی، خواجہ علاء الدین (برادر خواجہ شمس الدین) نے جلال الدین ختنی کو جو شیراز میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے خط لکھا کہ دس ہزار اشرفیاں شیخ کی خدمت میں پہنچا دینا، سوء اتفاق یہ کہ جب نوکر شیراز میں پہنچا تو اس سے چند دن پہلے جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا، نوکر نے جلال الدین کے نام کا خط شیخ کو لے جاکر دیا، شیخ نے علاء الدین کو جواب میں یہ قطعہ لکھا،

پیام صاحب دولت علاء دولت و دین	کہ دین و دہر بہ ایام او ہمے نازد
رسید، پایہ دولت فزود سعدی را	بسے نماند کہ سر بر فلک برافرازد
مثال داد کہ صدر ختن جلال الدین	قبول خدمت او را التعہدے سازد
ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود	چنانکہ بر سر ابنائے دہر مے تازد
جلال زندہ نخواہد شدن دریں دنیا	کہ بندگان خداوندگار بنوازد
طمع ندارم ازو در سرائے عقبے نیز	کہ از مظالم مردم بما پردازد

فرمان ۱۲

یعنی اس کا تو چنداں رنج نہیں کہ جلال الدین اب زندہ نہیں، ہو سکتا کہ میری حق رسی کر سکے، رونا یہ ہے کہ قیامت میں بھی اس کو اوروں کی دادرسی سے اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ ہم غریبوں کی طرف متوجہ ہو،

خواجہ شمس الدین نے قطعہ پڑھ کر حکم دیا کہ فوراً پچاس ہزار اشرفیاں شیخ کی خدمت میں بھیجدی جائیں شیخ قبول نہیں کرتے تھے لیکن چونکہ خواجہ موصوف نے قسمیں دلائی تھیں شیخ نے اس رقم سے ایک کاروان سرا تعمیر کرادی[۱]

خواجہ شمس الدین کو ارغون خاں (ہلاکو خاں کا پوتا) نے ۶۸۳ھ میں قتل کرادیا، ان کے بعد بھی شیراز کے تمام حکام اور امرا شیخ کی اسی طرح عزت اور تعظیم کرتے رہے ملک عادل شمس الدین تازی کے زمانہ میں عمال نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ سرکاری باغوں کے پھل نہایت گراں قیمت سے دوکانداروں کے ہاتھ بیچتے تھے اور بیچاروں کو خواہ مخواہ مول لینا پڑتا تھا، شیخ کے بھائی بقالی کا پیشہ کرتے تھے، ان کی دوکان اتابک کے محل کے سامنے تھی، ان پر بھی چند بار یہ آفت آئی آخر مجبور ہو کر بھائی کے پاس آئے شیخ نے یہ قطعہ لکھ کر ملک عادل کے پاس بھیجا،

ز احوال برادرم بہ تحقیق — دانم کہ ترا خبر نہ باشد

خرمائے بہ طرح مے دہندش — بخت بد ازیں تبر نہ باشد

اطفال برادر و مرد درویش — خرما بخورند و زر نہ باشد

آنگہ تو محصلے فرستے، — شخصے کہ ازو تبر نہ باشد

چنداں بزنندش اے خداوند — کز خانہ رہش بدر نہ باشد

اے صاحب من بغور ادرس — لطفے بہ ازیں دگر نہ باشد

ملک شمس الدین نے قطعہ پڑھنے کے ساتھ منادی کرادی کہ جن لوگوں سے ایسا معاملہ کیا گیا ہے، سب دربار میں حاضر ہوں، چنانچہ سب کی دادرسی کی، پھر شیخ

---

۱ یہ تمام حالات احمد بن بیستوں نے کلیات شیخ کے دیباچہ میں لکھے ہیں،

کی خدمت میں آیا اور نہایت معذرت کی، ساتھ ہی ہزار اشرفیوں کی تھیلی پیش کی کہ آپ کے بھائی کے نقصان کا تاوان ہے،

شیخ نے آخر زندگی میں شہر سے باہر ایک زاویہ بنوالیا تھا، رات دن وہیں رہتے تھے اور عبادت کرتے تھے، سلاطین اور امراء اسی آستانہ پر حاضر ہوتے اور مراتب اخلاص بجالاتے، کھانے کا یہ انتظام تھا کہ امراء خود کھانے لے جاتے یا بھجوادیتے شیخ جس قدر کھا سکتے کھا لیتے باقی ایک زنبیل میں رکھ کر دیوار سے لٹکا دیتے کہ ع بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست شیخ جب شیراز میں واپس آئے تو ابو بکر بن سعد کی حکومت کا زمانہ تھا اس کے بعد اس کا پوتا محمد بن سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ وہ نہایت صغیر سن تھا حکومت کے سب کام اس کی ماں انجام دیتی تھی، دو برس، ۷ مہینے کے بعد وہ مر گیا اس کے بعد محمد شاہ بن سلغر بن اتابک سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ سفاک اور خونریز تھا اس لئے آٹھ مہینے کے بعد ارکان دولت نے اس کو گرفتار کر کے ہلاکو خاں کے پاس بھیجدیا پھر اس کے بھائی نے برائے نام حکومت کی اور ۶۶۳ھ میں قتل کر دیا گیا اب اس خاندان میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا، آتش خاتون دختر اتابک سعد مسند حکومت پر بیٹھی اس نے ہلاکو خاں کے بیٹے منکو تیمور سے شادی کرلی ۶۸۶ھ میں وہ بھی مر گئی اور اب شیراز و فارس براہ راست تاتاریوں کی زیر حکومت آگیا،

یہ ارغون خاں بن اباقا آن خاں بن ہلاکو خاں کا زمانہ ہے شیخ نے اس کے عہد حکومت میں ۶۹۱ھ میں وفات پائی، تاریخ وفات "خاص" کے لفظ سے نکلتی ہے، کسی نے اس کو موزون کر دیا ہے، ع زخاصان بود زاں تاریخ شد خاص،

---

[۱] دیباچہ کلیات،

شیخ کا مزار مقام دلکشا سے کچھ فاصلہ پر پہاڑ کی تلی میں ہے، اور اب سعدیہ کے نام سے مشہور ہے، ہفتہ میں ایک دن مقرر ہے، لوگ زیارت کو جاتے ہیں، دن بھر وہیں رہتے ہیں، چائیں پیتے ہیں، لطف اُٹھاتے ہیں اور شام کو چلے آتے ہیں،

عام حالات اور اخلاق و عادات

شیخ نے گو اپنی سوانح نہیں لکھی لیکن گلستان اور بوستان میں جستہ جستہ ضمنی موقعوں پر اس قدر حالات لکھ دیتے ہیں کہ اُن سے اخلاق اور عادات کی پوری تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے،

شیخ کا شمار صوفیہ کبار میں ہے اور بے شبہ وہ پاکیزہ باطن اور صاحب حال تھے لیکن اُن کی مخصوص حالت یہ ہے کہ وہ اس رتبہ پر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد پہنچے تھے اُن کی اصلی سرشت یہ نہ تھی، بچپن سے شباب بلکہ ادھیڑپن کے زمانہ تک ان میں وہ اوصاف نظر آتے ہیں جو مولویوں کا خاصہ ہیں، یعنی خود بینی، حرفگیری، مشاجرت و مخاصمت، باپ کی صحبت کے اثر سے بچپن میں عبادت کا ذوق شوق پیدا ہو گیا ہے، شب بیداری اور درود وظایف میں مصروف ہیں، لیکن ساتھ ہی اوروں پر حرف گیری بھی کرتے جاتے ہیں کہ دیکھیے کسی کو نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی،

نظامیہ میں حدیث پڑھتے ہیں، کسی نے ان کے خلاف کچھ کہ دیا ہے، اُس پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں،

چو من داد معنی وہم در حدیث　　　برآید بہم اندرونِ خبیث

ایک درویش سے دولتمندی اور درویشی کے متعلق بحث کرتے کرتے دست و گریبان ہو جاتے ہیں اور دھول دھپے تک نوبت پہنچا دیتے ہیں،

دشنام داد سفلطش گفتم گریبانم درید زنخدانش شکستم،

حج کا سفر ہے، ذوق و شوق میں احرام باندھے پا پیادہ جا رہے ہیں، اس حالت میں بھی زبان سے ناسزا کلمات نکل رہے ہیں، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

در سر دردی ہمدیگر فتادیم و داد فسق و جدال دادیم،

حسن پسندی، امرد پرستی تک پہنچ گئی ہے، اور ایسے کھُل کھیلتے ہیں کہ اسکا ذکر تک نہیں کیا جاسکتا،

بے شبہ یہ باتیں اُن کے عارض کمال کے داغ ہیں لیکن ایک رفارمر اور مصلح کے لئے ان تمام مراحل سے گزرنا ضرور تھا،

مولنا روم سے کسی نے ایک بزرگ کی نسبت کہا کہ "شاہد باز بود اما پاکباز بود" مولنا نے کہا "در کاوش کردی و گزاشتی"

شیخ نے چونکہ بیماریاں اُٹھا کر صحت پائی تھی، اس لئے وہ امراض (اخلاقی) کی حقیقت ماہیت، علامات، اور طریق علاج سے جس قدر واقف ہو سکے دوسرا نہیں ہو سکتا تھا اخلاقی بیماریوں میں اکثروں کو دھوکا ہوتا ہے اور مرض کو مرض نہیں سمجھتے، مثلاً ایک فقیہ فطری بدنفسی کی وجہ سے اپنے مخالف کو بُرا کہتا ہے اور اس کو ضرر پہنچاتا ہے لیکن اس کا نفس اس کو یہ دھوکا دیتا ہے کہ چونکہ یہ شخص فلاں مسئلہ کا قائل ہے بدعتی اور کافر ہے اس لئے اس کو بُرا کہنا اور اُس کی تکفیر کرنا غیرت مذہب کا اقتضا ہے، یا مثلاً ایک صوفی صاحب امرد پرستی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجاز حقیقت کا زینہ ہے، شیخ ان غلطیوں میں نہیں پڑ سکتا، چنانچہ امرد پرستی کی نسبت، نظر باز صوفیوں کی اس طرح پردہ دری کرتا ہے،

گروہے نشیند با خوش پسر	کہ ما پاکباز یم و اہل نظر
زمن پرس فرسودۂ روزگار	کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار

چہ طفل یک روزہ ہوشت نہ برد کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد

شیخ کے مزاج میں ظرافت حد سے زیادہ تھی، ایک دفعہ ایک مکان کرایہ پر لینا چاہتے تھے، ایک یہودی پڑوس میں رہتا تھا اس نے کہا ضرور خرید لے میں اس مکان کی حالت سے خوب واقف ہوں، اس میں کوئی عیب نہیں، شیخ نے کہا بجز اس کے کہ آپ اس کے ہمسایہ ہیں،

خواجہ ہمام ایک مشہور شاعر تھے اور محقق طوسی کے شاگرد تھے، شیخ سے اور ان سے تبریز میں ایک حمام میں ملاقات ہوئی، شیخ نے دانستہ ہمام سے چھیڑ چھاڑ شروع کی، ہمام ان سے واقف نہ تھے نام اور نشان پوچھا، شیخ نے کہا شیراز میں رہتا ہوں، ہمام نے کہا عجیب بات ہے ہمارے شہر میں شیرازی کتّوں سے زیادہ ہیں، شیخ نے کہا ہاں لیکن شیراز میں تو تبریزی کتے سے بھی کم (رتبہ) ہیں،

اتفاق یہ کہ ایک خوشرو جوان ہمام کو پنکھا جھل رہا تھا، شیخ اس سے لطف نظر اٹھانا چاہتا تھا لیکن ہمام بیچ میں حائل تھے، ہمام نے سلسلہ سخن میں کہا کہ شیراز میں ہمام کے شعر کا بھی چرچا ہے؟ شیخ نے کہا ہاں، یہ شعر اکثر زبانوں پر ہے،

در میان من و دلدار حجاب است ہمام وقت آں است کہ ایں پردہ بیک سو فگنم

ہمام کو گمان ہوا کہ یہ سعدی ہیں قسم دلا کر پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے شیخ نے مجبوراً بتایا، ہمام نے اٹھ کر شیخ کے پاؤں پر سر رکھ دیا، گھر لے گئے اور بڑی گرمجوشی سے مہمانیاں کیں[1]

مجد الدین ہمگر شیخ کے معاصر اور اسی دربار سے تعلق رکھتے تھے جس سے شیخ کو تعلق تھا، آج تو کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا لیکن اس زمانہ میں فارس کے ملک الشعرائی کا منصب جو شیخ کا حق تھا، قسمت نے ان کو عنایت کیا تھا،

[1] دولت شاہ ذکر سعدی،

سعد بن ابوبکر سعد زنگی ان کی تعظیم اور تکریم شیخ سے زیادہ کرتا تھا، اسی زمانہ میں امامی ایک شاعر تھا، زمانہ کی بے بصری نے ان کو بھی شیخ کا حریف بنادیا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ خواجہ شمس الدین محمد اور ملک معین الدین پروانہ اور نور الدین اور افتخار الدین نے یہ قطعہ لکھ کر مجد الدین ہمگر کے پاس بھیجا،

ز شمع فارس، مجد ملت و دین | سوالے سے کنند پروانہ ردم
ز شاگردان تو ہستند حاضر | رہی و افتخار و نور مظلوم
تو از اشعار سعدی و امامی، | کدامی بہ پسندی اندریں بوم

مجد الدین نے جواب میں لکھا،

ما گرچہ بہ نطق طوطی خوش نفسیم | بر شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری بہ اجماع امم | ہرگز من و سعدی بہ امامی نرسیم

شیخ کو بھی اس بے امتیازی کا رنج ہوا، چنانچہ یہ رباعی لکھی،

ہر کس کہ بہ بارگاہ سامی نرسد | از بخت سیاہ و بد کلامی نرسد
ہمگر کہ بہ عمر خود نکردہ است نماز | شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد[۱]

شیخ کے سیر و سفر کے ذکر میں جو واقعات ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اُن کو اس موقع پر دوبارہ پڑھنا چاہیے، جن سے شیخ کے اخلاق و عادات کی تصویر پوری نظر میں آجائے گی،

شیخ کی تصانیف

کلیات[۲] شیخ کا قدیم ترین قلمی نسخہ کتب خانہ دیوان ہند India office میں موجود ہے، جس کا نمبر ۱۱۱۷ ہے تاریخ استنساخ اول رجب ۷۲۸ھ یعنی شیخ کی وفات

---

[۱] تذکرہ دولت شاہ تذکرہ امامی ہروی،

[۲] یہ تمام مضمون شیخ عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر دکن کالج پونا نے ترجمہ کرکے ہم کو عنایت کیا ہے،

کے بعد قریب ۳۶ سال ہے، کاتب کا نام ابوبکر بن علی بن محمد ہے جس نے شیخ کے اصلی نسخہ سے نقل لی ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے "منقول من خط الشیخ العارف السعدی"

اس نسخہ سے شیخ کا نام شرف الدین بن مصلح الدین پایا جاتا ہے اور اس میں حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) عربی قصیدہ قافیہ میم (۲) دوسرا رسالہ (۳) بوستان جس کا نام یہاں سعدی نامہ لکھا ہوا ہے (۴) گلستان (۵) طیبات (۶) بدائع (۷) خواتیم (۸) قصاید فارسیہ (۹) مراثی (۱۰) ملمعات (۱۱) مثلثات (تین زبانوں میں عربی، فارسی، اور ترکی) (۱۲) قصائد عربیہ (۱۳) ترجیعات (۱۴) مقطعات (۱۵) مجلس ہزل، ہزلیات، (۱۶) مطائبات (۱۷) رباعیات (۱۸) مفردات،

جو کتابیں کہ اس نسخہ میں داخل نہیں وہ یہ ہیں، رسائل ۱، ۳، ۴، ۵، ۶، غزلیات قدیم، صاحبیہ، مضحکات،

اہل یورپ نے شیخ کے کلام کے جو حصے شائع اور ترجمے کئے اس کا مختصر حال یہ ہے (ماخوذ از فہرست کتب قلمی فارسی موجودہ دیوان ہند، مرتبہ ڈاکٹر ایتھ Dr Ethe

رسالہ دوم (پانچ مجلسوں میں سے تیسری اور چوتھی مجلسیں) ایم، گویڈمان M. Gwedamen صاحب نے مع ترجمہ اور شرح کے شائع کیں، بمقام بریسلا ۱۸۹۸ء Bresla

بوستان، نہایت نفیس اڈیشن مع شرح فارسی کے، ایچ گراف صاحب K. H. Graff کے اہتمام سے چھپا ہے بمقام دینیا Vienna ۱۸۵۰ء

متن مع نوٹس، مرتبہ اے، راجرس A. Rodgers بمقام لندن ۱۸۹۱ء

تراجم، در زبان جرمن، کے، ایچ گراف K. H. Graff صاحب کا ترجمہ جینا Jena، ۱۸۵۰ء

تراجم در زبان جرمن شلیخٹا و یسیرڈ Schlecha Weosched دنیا Vienna سنہ ۱۸۵۱ء

" " روکرٹ Ruckert صاحب کا ترجمہ لیپزک Liepzig سنہ ۱۸۸۲ء

" فرینچ باربیر ڈی مینارڈ Barbierde maynard کا پارس سنہ ۱۸۸۰ء

" انگریزی ایچ۔ دلبر فورس کلارک H. Wilberforce Clark صاحب
کا ترجمہ، بمقام لندن سنہ ۱۸۷۹ء

" " جی۔ ایس۔ ڈیویی G. S. Davie صاحب کا ترجمہ،
بمقام لندن سنہ ۱۸۸۲ء

منتخبات مترجمہ رابنس Robinson لنڈن سنہ ۱۸۸۳ء

ایک ترکی میں بمقام قسطنطنیہ سنہ ۱۲۸۸ھ میں شائع ہوا ہے،

گلستان، اڈیشنس، گلیاڈون Gladwin صاحب کی متن مع انگریزی
کلکتہ سنہ ۱۸۰۶ء

" " ای۔ بی۔ ایسٹورک E. B. Eastwick صاحب کی مع فرہنگ
بمقام ہرٹ فرڈ Hertford سنہ ۱۸۵۰ء

" " جانسن Johnson کی مع فرہنگ، ہرٹ فرڈ سنہ ۱۸۶۳ء

" " جے۔ ٹی۔ پلاٹس J. T. Platts لنڈن سنہ ۱۸۷۴ء

تراجم، در فرینچ۔ اے۔ ڈیورائر A. Du Ryre کا ترجمہ سنہ ۱۶۳۴ء

ڈالیگر Dalegre کا " سنہ ۱۷۰۴ء

گاندان Gaundin کا " سنہ ۱۷۸۹ء

سیمیلٹ Semelet کا " سنہ ۱۸۵۸ء پارس

لاطینی جنٹس Gentius کا ترجمہ ۱۶۵۱ء اڈیشن دوم ۱۶۵۵ء

تراجم، در جرمن، ادم اولیاری اس (Adam olearions) کا بمقام

شلیسوگ Schlesswing ۱۶۵۴ء

بی۔ ڈارن B. Darn صاحب کا، ہامبرگ

۱۸۲۲ء

وولف Wolff کا، سٹٹگارٹ Stuttgart ۱۸۴۱ء

کے۔ ایچ۔ گراف K. H. Graff کا، لیپزگ ۱۸۴۶ء

در انگریزی، گلیاڈون صاحب Gladwin کا، کلکتہ ۱۸۰۶ء

لندن ۱۸۳۳ء

ڈیوموین Dumoulin کا ۱۸۰۶ء

جیمس راس James Ross کا، لندن ۱۸۲۳ء

نئی ایڈیشن ۱۸۹۰ء

ای۔ بی۔ ایسٹوک E. B. Eastwick ہرٹ فرڈ ۱۸۵۲ء

نئے ایڈیشن، لندن ۱۸۸۰ء

جی۔ ٹی۔ پلاٹس G. T. Platts کا، لندن ۱۸۷۳ء

در روسی، اس۔ النسرینیز S. Nusarinny کا، ماسکو ۱۸۵۷ء

در پولش، آٹونوسکی Otwinowsky کا، وارسا ۱۸۷۹ء

در ترکی، قسطنطنیہ میں ۱۸۷۴ء ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا اور مع شرح سودی کے

تراجم ۱۲۸۶ء اور ۱۲۹۳ء میں،

عربی میں بمقام بولاق ۱۲۶۳ھ ہندوستانی میں میر شیر علی افسوس کا کلکتہ ۱۸۰۱ء
جو زیر نگرانی جان گلکرسٹ John Gilchrist صاحب کے شائع کیا گیا
طیبات، کی چودہ غزلیں گراف K. H. Graff صاحب نے ترجمہ کر کے جرمن میں شائع کیں
بدائع، دس " " " " " " " " "
خواتیم، سات " " " " " " " " "
قصائد فارسیہ کے انیس قصائد " " " " " " " "
مراثی، چند مراثی " " " " " " "
رباعیات، چند رباعیات " " " " " " "
مفردات، کو لاٹوش Latouche صاحب نے ایڈٹ اور شائع کیا ہے،
صاحبیہ، کو باخر Bacher صاحب نے مع ترجمہ شائع کیا ہے، اسٹراسبرگ
Strassburg ۱۸۷۹ء

شیخ کی شاعری | شریعت شعر کے تین پیغمبر ہیں، ان میں ایک شیخ بھی ہیں،

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

ہر پیغمبر، جداگانہ شریعت کا پیغمبر ہے، شیخ کی پیغمبری کا صحیفہ غزل ہے، خواجہ حافظ
نے غزل کو معجزہ بنا دیا تاہم کہتے ہیں،
ع استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما،
حضرت امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غزل میں سعدی کا پیرو
ہوں، مثنوی نہ سپھر میں لکھتے ہیں،

تا بجائے کہ حد پارسیان — اندریں عہد دو تن گشت عیاں

زاں یکے سعدیؒ ثانیش ہمام — ہر دو را در غزل آئین تمام

لیکن اور اصناف سخن میں شیخ کی شاعری اس درجہ پر تسلیم نہیں کی گئی امیر خسرو شیخ کی غزل گوئی کی تعریف کر کے لکھتے ہیں،

لیک اگر سوی دگر یازی دست — شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

خود شیخ کے زمانہ میں بھی اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا، اور اس کا چرچا شیخ تک بھی پہنچا، چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ شیخ اخلاق اور وعظ کے مضامین اچھے لکھ سکتے ہیں لیکن رزم کے مرد میدان نہیں،

کہ فکرش بلیغ است و رایش بلند — دریں شیوۂ زہد و طامات و پند

نہ در خشت و گوپال و گرز گراں — کہ ایں کار ختم است بر دیگراں

شیخ کو یہ رای ناگوار گزری، ایک رزمیہ داستان لکھ کر بوستان میں شامل کی، جس میں بہت کچھ زور طبع دکھایا، نظامی کے خاص خاص مشہور مضامین اور اشعار کا جواب بھی لکھا اور اُن سے بڑھا دینا چاہا مثلاً نظامی کا شعر تھا،

کمند اژدہاے مسلسل شکنج — دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

شیخ اس تشبیہ کو زیادہ صاف اور صورت نما کرتے ہیں،

بہ صید ہژبراں پرخاش ساز — کمند اژدہائے دہن کردہ باز

لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ سے یہ کمان زہ نہیں ہو سکی، دو چار قدم تن کر اور اکڑ کر چلتے ہیں، لیکن پھر طبعی بڑھاپے کے ضعف سے دفعتہً جھک جاتے ہیں، رزم کا آغاز کس زور و شور سے کیا ہے،

ع برانگیختم گرد ہیجا چو دود،

لیکن دوسرے ہی قدم میں لڑکھڑا کر گرتے ہیں،

ع چو دولت نہ باشد تہوّر چہ سود،

با اینہمہ چونکہ شیخ کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے، ہم اس رزمیہ کے چند اشعار نقل کرتے ہیں،

ہماندم کہ دیدیم گرد سپاہ — زرہ جامہ کردیم و مغفر کلاہ

چو ابر اسپ تازی برانگیختم — چو باران پلارک فرو ریختم

دو لشکر بہم بر زدند از کمین، — تو گفتی زدند آسمان بر زمین

ز باریدن تیر ہمچوں تگرگ — ز ہر گوشہ برخاست طوفان مرگ

بہ صید ہژبران پرخاش ساز — کمند اژدہائے دہن کردہ باز

زمین آسمان شد ز گرد کبود — چو انجم درو برق شمشیر و خود

غرض نہ اُن کا یہ دعویٰ مسلم ہے کہ وہ رزم میں فردوسی اور نظامی کے دوش بدوش چل سکتے ہیں، نہ امیر خسرو وغیرہ کی یہ رائے صحیح ہے کہ وہ غزل کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتے قصائد اور مثنوی میں اُن کی بلند پائگی سے کون انکار کرسکتا ہے،

ایران میں شاعری کو تین سو برس گذر چکے تھے لیکن شاعری اب تک اصلی جادہ پر نہیں آئی تھی، شاعری کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہو اور وہ اس جذبہ کو اُسی جوش و خروش سے ادا کردے جس جوش سے وہ پیدا ہوا تھا، فردوسی نظامی، فرخی، انوری کی کمال شاعری میں کس کو کلام ہے لیکن ان میں سے اپنے دل کے جذبات کس نے لکھے؟ فردوسی قدرتی شاعر ہے، اس لئے وہ غیروں کے جذبات بھی اُسی

طرح ادا کرتا ہے کہ گویا خود اس کے دل سے اُٹھے ہیں، عرب کی تحقیر اور طعن کے وقت
وہ خونریز دگرد بن جاتا ہے، سہراب کی ماں کا نوحہ اس درد سے لکھا ہے کہ گویا اُسکو سہراب
کی ماں کی زبان ہات آگئی ہے، لیکن فرض کرو یہ واقعات خود فردوسی پر پیش آتے تو کیا
ان شعلوں کی شرر فشانی اور نہ بڑھ جاتی، مدحیہ قصائد تو بالکل ہی تصنع اور آورد تھی غزل
بھی اس وقت تک گویا قصیدہ ہی کی ایک دوسری صورت تھی، محبت عشق کے جذبات
اس میں ادا نہیں کئے جاتے تھے، بلکہ جس طرح مدحیہ قصائد میں ممدوح کی شجاعت و
قدرت، جود و سخا، تلوار اور گھوڑے کی مدح کرتے تھے، غزل میں معشوق کے حسن اور اعضا
کے اوصاف بیان کرتے تھے،

شیخ پہلا شخص ہے جس نے شاعری کا صحیح استعمال کیا، تفصیل اسکی حسب
ذیل ہے،

سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے آزادی ہے، عرب
کی شاعری کی اصلی روح یہی تھی، جو عجم میں آکر گم ہوگئی تھی، عرب کے شعرا سلاطین اور امرا کے
متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے متنبی سیف الدولہ کی مدح لکھ کر
لے جاتا ہے اور ساتھ ہی نہایت گستاخی اور بیباکی سے اس کو صلواتیں سُناتا جاتا ہے
فردوسی نے بھی محمود کی جان خراش ہجو لکھی، لیکن رو در رو نہیں بلکہ چوری سے اور پھر تمام عمر
بھاگتا پھرا، شیخ کو کئی درباروں سے تعلق رہا، ابوبکر سعد زنگی اس کا خاص ممدوح اور آقا
تھا، انکیانو جو خاندان اتابک کے خاتمہ کے بعد ہلاکو خاں کے جانشین کی طرف سے شیراز
کا گورنر تھا اُس سے بھی شیخ کو تعلق رکھنا پڑتا تھا ان سب کے مقابلہ میں اُس نے اپنی آزادی
قائم رکھی، ابوبکر بن سعد نے ہلاکو خاں کے اطاعت قبول کر لی تھی یہاں تک کہ جب ہلاکو خاں

نے بغداد پر چڑھائی کی تو ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد کو فوج دے کر اعانت کے لئے بھیجا اور جب بغداد تاراج ہوا تو ابوبکر نے مبارک باد کے لئے سفارت بھیجی، با اینہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا اور اس قدر پر اثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے، یہ مرثیہ درحقیقت ابوبکر بن سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور بربادی میں ہلاکو خاں کا ساتھ دیا، شیخ نے اس مرثیہ میں ابوبکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پر مدح کے پیرایہ میں چوٹ کی،

خسرو صاحبقران خوش زمان بوبکر سعد	آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست و اوصافش گزین
مصلحت بود اختیار رای روشن بین او	زیردستان را سخن گفتن نشاید جز چنین

یعنی ابوبکر نے جو ہلاکو کو مدد دی تو اس میں کچھ مصلحت ہوگی،

انکیانو کی مدح میں شیخ کے متعدد قصیدے ہیں، لیکن ہر قصیدہ میں نہایت دلیری سے اُس کو نصیحت کی ہے اور صاف کہہ دیا کہ جس کو دربار کی طمع نہیں وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈر سکتا۔

سعدیا چندانکہ میدانی بگو	حق نباید گفتن الا آشکار
ہر کہ را خوف و طمع دربار نیست	از خطا باکش نباشد وز تتار
خسرو عادل امیر نامور	انکیانو خسرو عالی تبار

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

حرامش باد ملک بادشاہی	کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم
جہاں سالار عادل انکیانو	سپہدار عراق و ترک و دیلم
چنیں پند از پدر نشنید باشی	الا اگر ہوشیاری بشنو از عم

نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ | سخن ملکے است سعدی را مسلم

بوستان میں لکھتے ہیں،

دلیر آمدی سعدیا در سخن | چو تیغت بدست است فتحے بکن
بگو آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ | نہ رشوت ستانی و نہ رشوہ دہ
طمع بند و دفتر ز حکمت بشوے | طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگوے

اس زمانہ میں شاعری کا بڑا حصہ مدح تھی اور شعرا اسی کے ذریعہ سے بسر کرتے تھے شاعری کی بڑی اصلاح یہ تھی کہ شاعری کے چہرہ سے یہ داغ مٹا دیا جائے شیخ نے یہ فرض نہایت نفس کشی کے ساتھ ادا کیا، وہ تنگ حال اور مفلس تھا، لوگ اس کو ترغیب دیتے تھے کہ مدحیہ قصائد لکھو تو اچھی طرح بسر ہوگی، وہ جواب دیتا تھا کہ آزاد گردن کسی کے آگے جھک نہیں سکتی،

گویند سعدیا بچہ بطال ماندۂ | سختی مبر کہ وجہ کفافت معین است
یکچند اگر مدیح کنی کامران شوی | صاحب ہنر کہ مال ندارد تغابن است
بے زر میسرت نشود کام دوستان | چوں کام دوستان نہ دہی کام دشمن است
آرے مثل بہ کرگس مردار خور دہند | سیمرغ را کہ قاف قناعت نشیمن است
از من نیاید ایں کہ بہ دہقان و کدخدا | حاجت برم کہ فعل گدایان خرمن است

عرب میں مدح کے یہ معنے تھے کہ شاعر جس شخص کا ممنون ہوتا تھا یا جو شخص قوم میں قابل مدح کام کرتا تھا، شاعر اُس کا اظہار کرتا تھا، لیکن صلہ اور انعام سے اس کو کچھ واسطہ نہ ہوتا تھا،

زہیر بن ابی سلمے جب ہرم بن سنان کے دربار میں گیا اور ہرم کو سلام کیا تو ہرم

نے حکم دیا کہ زہیر جب دربار میں آئے اور سلام کرے تو اس کو صلہ دیا جائے اس کے بعد سے زہیر کا معمول ہو گیا کہ جب دربار میں جاتا تو کہتا کہ تمام مجمع کو سلام کرتا ہوں لیکن ہرم کو نہیں، عرب میں سب سے پہلے جس شاعر نے قصیدہ پر صلہ لیا وہ نابغہ ذبیانی تھا، عرب نے اُس کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا،

شیخ نے مدحیہ قصائد کو عرب کے قدیم انداز پر لانا چاہا اس نے سلاطین و امراء کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں لیکن اُن کے صحیح اوصاف بیان کرتا ہے اور مبالغہ آمیز خیالات جو مدحیہ قصائد کے عنصر میں داخل ہو گئے تھے اُن کو لغو بتاتا ہے، مثلاً قصیدہ کے خاتمہ میں ممدوح کو یوں دعا دیتے تھے کہ لاکھوں کروڑوں برس زندہ رہے، یہاں تک کہ مرزا غالب نے قصہ ہی فیصل کر دیا، ع تا خدا باشد بہادر شاہ باد

شیخ ہزار برس کی دعا دینے پر بھی راضی نہیں،

ہزار سال نگویم بقاے عمر تو باد	کہ ایں مبالغہ دانم زعقل نشماری
ہمیں سعادت توفیق بر مزیدت باد	کہ حق گزاری و ناحق کسے نیازاری
نہ کاہد انچہ نوشتہ است عمر و نفزاید	پس ایں چہ فائدہ گفتن کہ تا بہ حشر بپاے

ممدوح کو عموماً ابر گہر فشان اور دریای بیکران کہا کرتے تھے، **شیخ** کہتا ہے،

نہ گوئمت چو زبان آوران رنگ آمیز	کہ ابر مشک فشانی و بحر گوہر زاے

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

من ایں غلط نہ پسندم زرای روشن خویش	کہ دست و طبع تو گویم بہ بحر و کان مانند

یہ انوری کے اس شعر پر تعریض ہے،

گر دل بحر و دست کاں باشد	دل و دست خدائگان باشد

مجد الدین رومی کی مدح میں کہتے ہیں،

نگوئمت بہ تکلف فلاں دولت و دین	سپہر مجد د موالے جہاں دانش و داد

خواجہ شمس الدین محمد اور علاء الدین کا تمام دنیائے اسلام پر احسان تھا تاتاریوں کے آشوب ناک زمانہ میں اسلام کی جو کچھ حالت قائم رہ گئی وہ انہی بھائیوں کی بدولت تھی اس لئے شیخ ان دونوں بھائیوں کی مدح نہایت اخلاص سے کرتا ہے، لیکن بالکل اسی طرح جس طرح آج کسی گورنر یا حاکم صوبہ کو سچا سپاسنامہ پیش کیا جاتا ہے، مثلاً خواجہ علاء الدین کی مدح میں کہتا ہے،

خدائے خواست کہ اسلام در حمایت او	ز شیر حادثہ در بارۂ امان ماند
وگرنہ فتنہ چناں کردہ بود دوران نیز	کزین دیار نہ مرغ و نہ آشیان ماند
توآں جواد زمانی کز اژدحام زماں	ورت بر مشرب شیریں کاروان ماند

جذبات

(۲) شیخ کی شاعری عموماً جذبات سے لبریز ہے، وہ شاعری کی کسی صنف کو رسم اور تقلید کی حیثیت سے نہیں برتتا، وہ جانتا ہے کہ شاعری کا اصلی عنصر جذبات ہیں اس لئے وہ اُسی وقت شعر کہتا ہے، جب اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے، غزل اسوقت تک محض معشوق کی مداحی تھی شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کئے، جن لوگوں کا اس نے مرثیہ لکھا وہ لوگ تھے جن کے مرنے سے اس کو سخت صدمہ پہنچا تھا، اخلاقی مضامین بھی وہ اسی وقت ادا کرتا ہے جب کسی موثر واقعہ کے پیش آجانے سے خود اس کے دل پر سخت اثر پڑتا ہے مثلاً

مناجات شوریدۂ در حرم	تنم مے بلرزد چو یاد آورم
کہ میگفت و فرہا ناہش مے فروخت	یکم روز بر بندۂ دل بسوخت

مرا رقتے در دل آمد بریں | کہ پاک است و خرم بہشت بریں
دراں جاے پاکاں امیدوار | بگل آلودۂ معصیت را چہ کار

امرا میں سے اُس کو سب سے زیادہ محمد بن ابی بکر بن سعد زنگی سے محبت تھی، وہ نہایت ہنرور اور شوکت و شان کا شہزادہ تھا، وہ سفر میں تھا کہ باپ کی مرض الموت کی خبر سُنی اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں شیراز کو روانہ ہوا، لیکن راہ میں قضا کر گیا، چونکہ ولیعہد تھا سب لوگ منتظر تھے کہ وہ آکر تخت و تاج کا مالک ہوگا، اس بنا پر اس کے مرنے کا عام ماتم ہوا شیخ کو سخت صدمہ ہوا، اسی حالت میں مرثیہ لکھا جس کے ہر شعر سے خون جگر کی بو آتی ہے،

بزرگان چشم و دل در انتظار | عزیزاں وقت و ساعت می شمارند
غلاماں دُر و گوہر مے فشانند | کنیزان دست و ساعد مے نگارند
ملک خان و سیاق و بدرو ترخاں | بر رہواران تازی برسوار ند
کہ شاہنشاہ عادل سعد بو بکر | بہ ایوان شہنشاہی در آرند
حرم شادی کناں برطاق و ایوان | کہ مروارید بر تا بخش ببارند
امید تاج و تخت خسروی بود | ازیں غافل کہ تابوتش در آرند
چہ شد پاکیزہ رویان حرم را | کہ بر سر کاہ و بر زیور غبارند
نمے دانم حدیث نامہ چوں است | ہمے دانم کہ عنوانش بخون ست

مرثیہ کی اصلاح

(۳) اسوقت تک مرثیہ کا عام انداز یہ تھا کہ اشخاص کا مرثیہ لکھتے تھے قومی یا ملکی مرثیہ کا مطلق رواج نہ تھا، شیخ پہلا شخص ہے جس نے قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا، عباسیوں کی سلطنت گو اب برائے نام رہ گئی تھی پھر بھی پانچسو برس کی اسلامی یادگار تھی اور بغداد تمام

اسلامی دنیا کا مرکز تھا، اس لئے اُس کا ٹُٹنا قوم کا ٹُٹنا تھا، شیخ نے اس بنا پر خلیفہ اور بغداد اور سلطنت کا مرثیہ لکھا اور جس دل سے لکھا اس کا اندازہ ان اشعار سے خود کرسکتے ہو،

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین	بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنین[1]
اے محمد اگر قیامت سر بروں آری زخاک	سر بروں آر و قیامت در میان خلق بین
نازنینان حرم را موج خونِ بے دریغ	ز آستان بگذشت و مارا خون دل از آستین
دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام	قیصران روم سر بر خاک و خاقان بر زمین
خون فرزندان عم مصطفےٰ شد ریختہ	ہم بر آں جائے کہ سلطاناں نہادندے جبین
باش تا فردا بہ بینی روز داد و رستخیز،	کز لحد باز خم خون آلودہ برخیزد دفین

ان اجمالی اور سرسری خصوصیات کے بعد ہم ان انواع شاعری سے مفصل بحث کرتے ہیں جن کو شیخ نے ترقی دی یا اُس کا رنگ بدل دیا،

اخلاقی شاعری

(۴) اخلاقی شاعری شیخ سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، حکیم سنائی خیام، اوحدی، عطار، نے اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا تھا، تاہم شیخ نے اس آسمان کو اور بلند کر دیا، اخلاقی شاعری پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جاسکتی ہے،

(۱) کس قسم کے اخلاق کی تعلیم کی، اور ان میں کس حد تک فلسفیت اور نکتہ سنجی پائی جاتی ہے،

(۲) فلسفہ اخلاق کو کس طرح شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اخلاقی مسائل اگر محض سادہ طریقہ پر نظم میں ادا کر دیئے جائیں تو فلسفہ ہوگا شاعری نہ ہوگی،

---

[1] دیکھو مستعصم کے مرنے کا رنج نہیں کرتا بلکہ ملک کے زوال کا رنج کرتا ہے اور انہیں باتوں کا ذکر کرتا ہے جن سے عام قوم کو تعلق ہے،

شیخ نے اخلاقی عنوان جو اختیار کئے وہ حسب ذیل ہیں،

عدل وتدبیر، احسان عام، عشق ومحبت، تواضع، رضا بالقضاء، قناعت، تربیت شکر، توبہ، مناجات،

عدل وتدبیر اصل میں پالیٹکس اور سیاست سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چونکہ ان کو اخلاق سے نہایت قوی تعلق ہے، شیخ نے اس کو بھی اخلاق میں شامل کرلیا، ایشیائی ملکوں میں سلطنت کی بنیاد بادشاہ پرستی پر قائم ہوتی ہے اور وہ حاکم علی الاطلاق سمجھا جاتا ہے، اگر وہ عدل وانصاف کرے تو اُس کی عنایت ہے اور نہ کرے تو اُس کو کوئی ٹوک نہیں سکتا،

اگر شہ روز را گوید شب است ایں   بباید گفت اینک ماہ و پرویں

لیکن شیخ نے مختلف حکایتوں کے پیرایہ میں بتایا کہ ہر شخص کو نہایت آزادی کے ساتھ بادشاہ پر نکتہ چینی کا حق ہے، شیخ نے آزادانہ اعتراض کو جس پیرایہ میں ادا کیا، آزادی بیباکی اور جانبازی کی اس سے بڑھ کر تعلیم نہیں ہوسکتی،

ایک ظالم بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ لوگوں کے جانور زبردستی پکڑ کر اُن سے کام لیتا تھا اتفاق سے ایک دن شکار کے پیچھے فوج کا ساتھ چھوٹ گیا اور ایک گاؤں میں رات بسر کرنی پڑی ایک شخص کو دیکھا کہ اپنے گدھے کو اس طرح مار رہا ہے کہ اس کے ہات پاؤں بیکار ہوتے جاتے ہیں، بادشاہ نے روکا، اس نے کہا میں اس لئے اس کو بیکار کئے دیتا ہوں کہ ہمارے ملک کا بادشاہ بیگار میں نہ پکڑے، یہ کہہ کر بادشاہ کو خوب بُرا بھلا کہا، صبح کو اہل فوج ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے گاؤں میں پہنچے اور بادشاہ تخت گاہ میں واپس آیا، یہاں پہنچکر اس نے اس شخص کو پکڑ بلایا اور رات کی گستاخی کی سزا دینی چاہی، اُس نے کہا،

نہ تنہا منت گفتم اے شہریار   کہ برگشتہ بختی و بدروزگار

چرا خشم بر من گرفتی و بس ‏— منت پیش گفتم همه خلق پس

یعنی مجھی پر کیوں غصہ ہے، تجھ کو تو سب بُرا کہتے ہیں، فرق یہ ہے، کہ لوگ پیچھے بُرا کہتے ہیں، میں نے سامنے کہا،

چو بیداد کردی توقع مدار ‏— که نامت به نیکی رود در دیار

ترا چاره از ظلم برگشتن است ‏— نه بیچارهٔ بے گنه کشتن است

یعنی تجھ کو یہ مناسب ہے کہ ظلم سے باز آئے یہ نہیں کہ ایک بیگناہ کو قتل کر دے،

ز نامهربانی که در دورِ تست ‏— همه عالم آوازهٔ جورِ تست

عجب گر منت بر دل آمد درشت ‏— بکُش گر توانی همه خلق کشت

بداں کے ستوده شود بادشاه ‏— که خلقش ستایند در بارگاه

چه سود آفرین بر سر انجمن ‏— پسِ پرده نفرین کنان مرد و زن

همے گفت و شمشیر بالاے سر ‏— سپر کرده جان پیش تیر قدر

ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش کی حق گوئی سے بادشاہ ناراض ہوا اور اس کو قید کر دیا، اُس کے دوستوں نے سمجھایا کہ بادشاہ کے سامنے یہ آزادی خلاف مصلحت تھی، درویش نے جواب دیا،

رسانیدنِ امرِ حق طاعت است ‏— ز زندان نترسم که یک ساعت است

کسی نے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی، بولا کہ یہ اس کی حماقت ہے ایک ساعت نہیں تمام عمر اُس کو قید خانہ میں رہنا ہوگا، درویش نے کہا،

که دنیا همے ساعتِ بیش نیست ‏— غم و خرّمی پیش درویش نیست

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی زبان گدّی سے کھینچ لے جائے، درویش نے کہا مجھ کو اس کی بھی

پروا نہیں، مجھ کو جس سے کہنا سننا ہے وہ بولے بغیر میری بات سمجھ سکتا ہے،

من از بیزبانی ندارم غمے　　کہ دانم کہ ناگفتہ داند ہمے

اس قسم کی متعدد حکایتیں نہایت پر اثر طریقہ سے لکھی ہیں جن سے اس نے اپنے تمام ابنائے زمانہ کے خلاف لوگوں کو آزادی اور بیباکانہ حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور جب یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ کا یہ قول نہ تھا بلکہ عمل بھی تھا تو اس کی تعلیم کا دل پر نہایت قوی اثر ہوتا ہے، شیخ نے یہ بھی بتایا کہ ملک کی آمدنی میں بادشاہ کا صرف اس قدر حق ہے کہ بقدر ضرورت اس سے تمتع اٹھائے، اس سے زیادہ اس کو کوئی حق نہیں، ایک سادہ وضع بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ کسی نے اس سے کہا کہ حضور اگر دیبائے چینی کی قبا زیب تن فرماتے تو زیادہ موزون تھا، بادشاہ نے کہا،

نہ از بہر آں مے ستانم خراج　　کہ زینت کنم بر خود و تخت و تاج

مرا ہم زصد گونہ آز و ہوا است　　ولیکن نہ تنہا خزینہ مرا است

خزائن پر از بہر لشکر بود　　نہ از بہر آئین و زیور بود

چو دشمن خر روستائی برد　　ملک باج و دہ یک[1] چرا مے خورد

یہ خود شیخ کے خیالات ہیں لیکن بلاغت کے اصول کے لحاظ سے بادشاہ کی زبان سے ادا کیا ہے کہ بادشاہوں پر اس کا اثر زیادہ ہوگا،

احسان عام　احسان کا مضمون ایشیا کا مرغوب عام مضمون ہے، اور شیخ نے اس مضمون کو اسی عام طریقہ پر لکھا ہے جو ایشیائی طبائع کا عام انداز ہے، حاتم طائی کی فیاضیوں کی جھوٹی حکایتیں بڑی آب و تاب سے لکھی ہیں اور یہ نہ سمجھے،

بیا بہ ملک قناعت کہ درد سر نہ کشی　　زقصہ ہا کہ بہ ہمت فروش طرستند

[1] وہ محصول جس کو عربی میں عشر کہتے ہیں، یعنی آمدنی کا دسواں حصہ،

Courtesy Prof Shahid Amin. Digitized by eGangotri

یہ بھی ہدایت کی ہے کہ مستحق اور غیر مستحق کی تمیز کی کوئی ضرورت نہیں،

گرہ بر سر بند احسان مزن — کہ ایں مکر و شیداست و آں زرق و فن

اخیر میں بڑا دل کر کے یہ تفریق کی ہے کہ ظالموں کے ساتھ احسان نہ کرنا چاہئے تاہم اس باب میں بھی شیخ نے بعض نکتے اپنے زمانہ کے عام سطح سے بالاتر لکھے ہیں، مثلاً دینداروں کے نزدیک محاسن اخلاق جس قدر ہیں مثلاً عفو، حلم، مروت، جود و کرم سب مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر مذہب والوں کے ساتھ عموماً اشداء علی الکفار کا برتاؤ کرنا چاہئے، لیکن شیخ کے احسان عام کا بادل، ویرانہ و چمن دونوں پر یکساں برستا ہے،

اس نے ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر کو مومن سمجھ کر مہمان کیا، جب اس کا گبر ہونا ظاہر ہوا تو دسترخوان پر سے اٹھا دیا اس پر وحی آئی کہ

منش دادہ صد سال روزی و جان — ترا نفرت آمد از و یک زمان

یعنی میں نے تو اس کو سو برس تک کھلایا پلایا، تم دم بھر بھی اس کے ساتھ بسر نہ کر سکے،

عشق — شیخ کے زمانہ میں مسلمانوں کی قوتوں میں یک لخت زوال آچکا تھا، اس لئے عشق و محبت کے سوا اور کیا کام باقی رہا تھا، شیخ نے عام مذاق کے لحاظ سے اس راگ کا چھیڑنا بھی ضروری سمجھا اور اپنے دانست میں اس میں بھی اصلاح کی، یعنی عشق مجازی کو بُرا کہا اور عشق حقیقی کے محاسن بیان کئے، لیکن سچ یہ ہے کہ اگر ایک اخلاقی کتاب سرے سے اس فتنہ انگیز مضمون سے پاک رہتی تو بہت اچھا ہوتا

ع اہل زکام را مدہ ایں گل کہ بو کنند،

قناعت تواضع اور رضا وغیرہ کو جادو اثر طریقہ سے بیان کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین کے بار بار اعادہ کرنے سے قوم میں افسردگی، بیکاری، پست ہمتی، پیدا ہوتی

ہے اس لئے یہ مضامین ہمارے اخلاقی دفتر سے چند روز کے لئے نکال دینے کے قابل ہیں،

قناعت بظاہر پست ہمتی کا دوسرا نام ہے، اور اس میں شک نہیں کہ قناعت کے جو غلط معنے عموماً علما اور زہاد نے دلوں میں بٹھا دیتے ہیں اس نے قوم کے اپاہج بنانے میں بہت مدد دی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ نے قناعت کے جو معنے قرار دیئے وہ انسان کی خودداری، اور عزت نفس کا سب سے ضروری مرحلہ ہے، ایشیائی حکومتوں میں ہر قسم کے بیہودہ اخلاق مثلاً خوشامد، ذلت نفس، نفاق، ریا، زمانہ سازی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ ان باتوں کے بغیر کوئی شخص دولت اور عزت نہیں حاصل کرسکتا، اس لئے دولت وعزت کی پروا نہ کرنا ان عیوب سے بچنے کا سب سے پہلا مرحلہ ہے، شیخ اسی بنا پر قناعت کی تعلیم دیتا ہے،

قناعت کن اے نفس براندکے ‌ ‌ ‌ ‌ کہ سلطان و درویش بینی یکے

چرا پیش سلطان بہ خواہش روی ‌ ‌ ‌ ‌ چو یکسو نہادی طمع خسروی

وگر خود پرستی شکم طبلہ کن ‌ ‌ ‌ ‌ در خانہ ایں و آں قبلہ کن

قناعت سرافرازد اے مرد ہوش ‌ ‌ ‌ ‌ سر پر طمع بر نیاید ز دوش

کسے را کہ درج طمع در نوشت ‌ ‌ ‌ ‌ نباید بہ کس عبد و چاکر نوشت

کند مرد را نفس آمارہ خوار ‌ ‌ ‌ ‌ اگر ہوشمندی، عزیزش مدار

گر آزادۂ بر زمین خسپ و بس ‌ ‌ ‌ ‌ مکن بہر قالی، زمین بوس کس

چو بینی کہ از سعی بازو خورم ‌ ‌ ‌ ‌ بہ از میدہ بر خوان اہل کرم

یعنی اگر تم قناعت اختیار کرو گے تو تم کو بادشاہ اور فقیر یکساں نظر آئیں گے، تم بادشاہ کے آگے کیوں سر جھکاتے ہو، طمع چھوڑ دو تم خود بادشاہ ہو، جو شخص طمع چھوڑ دے گا وہ اپنے

آپ کو غلام اور خانہ زاد نہیں لکھ سکتا، نفس آمارہ انسان کو ذلیل کرتا ہے، اگر تم کو عقل ہے تو تم نفس کی عزت کرو، تم کو زمین پر پڑ کر سو رہنا چاہیئے، لیکن قالین کے لئے کسی کے آگے زمین نہیں چومنی چاہیئے اس سے بڑھ کر کیا شریفانہ تعلیم ہو سکتی ہے،

اس سے ظاہر ہے کہ اگر عزت نفس کے قائم رہنے کے ساتھ دولت و ثروت، نام و نمود، جاہ و اعزاز حاصل ہو سکتا ہو تو شیخ اس سے باز رہنے کی تعلیم نہیں دیتا،

ایک حکایت میں شیخ نے اس نکتہ کو صاف اور واضح کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ کسب اور جہد کو توکل پر ترجیح ہے، حکایت یہ ہے، کہ ایک شخص نے ایک لومڑی کو دیکھا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے، اس کو تعجب ہوا کہ یہ کھاتی پیتی کہاں سے ہے؟ اتفاق سے ایک شیر آ نکلا اس کے منہ میں شکار تھا، جب وہ کھا کر چلا گیا تو لومڑی نے اس کا بچا ہوا جھوٹا کھا لیا، یہ دیکھ کر اس شخص کو خیال ہوا کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں، میں بھی اسی طرح پاشکستہ بنکر بیٹھ رہوں، خدا کہیں سے روزی بھیجدے گا، لیکن کئی دن گزر گئے یہ یوں ہی فاقے کیا کیا آخر ہاتف غیب پکارا،

برو شیر غرندہ باش اے دغل	مپندار خود را چو روباہ شل

یعنی شیر ہو کر لومڑی کیوں بنتے ہو،

بہ چنگ آرو با دیگران نوش کن | نہ بر فضلۂ دیگران گوش کن

چو مردان ببر تن رنج و راحت رساں | مخنث خورد دست رنج کساں

بگیر اے جوان دست درویش پیر | نہ خود را بیفگن کہ دستم بگیر

تربیت — تربیت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اور بہت سے نکتے ایسے لکھے ہیں جو اس زمانہ کی سطح سے بالاتر ہیں، مثلاً قدیم تربیت میں لڑکوں کو زجر و توبیخ بلکہ جسمانی سزا دینی ایک

ضروری چیز تھی، اور آج تک وہ خیال قائم ہے، خود شیخ نے ایک معلم کی زبان سے کہا ہے

ع جور استاد بہ زمہر پدر،

لیکن شیخ کی خود تعلیم یہ ہے،

نو آموز را ذکر و تحسین وزہ (تعریف) | ز توبیخ و تہدید استاد بہ

صنعت و حرفت کی تعلیم، امراء کے بچوں کے لئے بھی لازمی قرار دی ہے حالانکہ آج

یورپ کی مثالیں دیکھ کر بھی ہم اُن چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے،

بیاموز پرورده را دست رنج | دگر دست داری چو قارون گنج

بپایان رسد کیسۂ سیم و زر | نگردد تہی کیسۂ پیشہ ور

چہ دانی کہ گردیدن روزگار | بہ غربت بگرداندش در دیار

چو بر پیشۂ باشدش دسترس | کجا دست حاجت برد پیش کس

عام خیال یہ ہے کہ بچوں کو کم درجہ کی خوراک اور موٹا جھوٹا کپڑا پہنانا چاہئے تاکہ آرام طلب اور عیش پسند نہ ہو جائیں، لیکن شیخ فرماتے ہیں،

پسر را نکو دار و راحت رساں | کہ چشمش نماند بہ دست کساں

یعنے بچے کو سیر و سامان سے رکھنا چاہئے تاکہ اس میں بلند نظری پیدا ہو اور لوگوں کی طرف اس کی نگاہیں حسرت سے نہ اُٹھیں،

اس زمانہ میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا، صوفیہ اور اہل نظر اس کو عشق حقیقی کی منزل اولین قرار دیتے تھے، اور ارباب ذوق کے لئے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی سامان نہ تھا شیخ چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا، اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا، اس لئے اس نے نہایت سختی سے اس کی برائیاں بیان کیں،

سراز مغز و دست از درم کن تہی　　چو خاطر بہ فرزند مردم نہی

مکن بد بہ فرزند مردم نگاہ　　کہ فرزند خویشت برآید تباہ

صوفیہ کا پردہ کھولتے ہیں،

گروہے نشینند با خوش پسر　　کہ ما پاک بازیم و اہل نظر

ز من پرس فرسودۂ روزگار　　کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار

ازاں برگ خرما خورد گوسفند　　کہ قفل است بر تنگ خرما و بند

صوفیوں کے اس دعویٰ کو کہ جمال سے ہم کو صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے اسطرح رد کرتے ہیں،

چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد　　کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خرد

محقق ہماں بیند اندر ابل　　کہ در خوبرویان چین و چگل

یعنی اگر صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو وہ ذرّہ ذرّہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے، خوش جمال اور پری جمال کی کیا تخصیص ہے، ایک باریک بین کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں جو چین اور چگل کے معشوقوں میں ہیں،

شیخ حسن پرستی سے منع نہیں کرتا لیکن بتاتا ہے کہ اس کا صحیح مصرف کیا ہے،

زن خوب و خوشخوئے آراستہ　　چہ ماند بہ نادان نوخاستہ

درو دم چو غنچہ دمے از وفا　　کہ از خندہ افتد چو گل برقفا

خرابت کند شاہد خانہ کن　　برو خانہ آباد گرداں بہ زن

افسوس ہے کہ عورتوں کا رتبہ شیخ کے زمانہ میں مردوں سے بہت کم سمجھا جاتا تھا، اسلئے

جو لوگ اپنی بیوی سے زیادہ محبت رکھتے تھے زن پرست کہلاتے تھے اور لوگ ان کو طعنہ دیتے تھے،

شیخ نے اگرچہ ان لوگوں کی طرف سے یہ معذرت کی ہے،

کسے را کہ بینی گرفتار زن | مکن سعدیا طعنہ بروے مزن
تو ہم جور بینی و بارش کشی | اگر یک شبے درکنارش کشی

زنان شوخ و فرمانده و سرکش اند | ولیکن بدیدم که در بر خوش اند

لیکن افسوس ہے کہ اس قدسی پیکر کی غرض و غایت لوگوں نے صرف نفس پرستی سمجھی، یہ نہ سمجھے کہ یہ جنس لطیف چہرۂ کائنات کا آب و رنگ ہے،

شیخ نے عورتوں کے متعلق ایک اور ہدایت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا معیار اخلاق کس قدر پست ہو گیا تھا،

زن نو کن اے دوست در ہر بہار | کہ تقویم پارینہ ناید بکار

لیکن اگر عورت بھی اس فلسفہ پر عمل کرے تو کیا جواب ہو گا؟

شیخ ہمہ تن مذہبی آدمی تھا، اس لئے اُس نے تعلیم و اخلاق کی بنیاد بھی مذہب پر رکھی ہے، مذہبی غلو میں حقیقت شناسی بہت کم قائم رہتی ہے، فرض کرو ایک شہر میں ہزاروں مسجدیں ہیں اور نمازیوں کی ضرورت سے زیادہ ہیں، باوجود اس کے ایک شخص پھر نئی مسجد بنائے تو مذہبی آدمی کبھی اس کام کو عبث اور بیفائدہ نہیں کہہ سکتا، حالانکہ قرون اولیٰ میں ایسے کام سے علانیہ روک دیا جاتا تھا حضرت عمر نے حکم بھیجدیا تھا کہ کسی شہر میں (بجز کوفہ و بصرہ کے) ایک سے زیادہ مسجد نہ بننے پائے، ولید نے جامع مسجد کی تعمیر میں شاہانہ حوصلہ مندی کی تو قوم نے علانیہ کہدیا کہ بیت المال کا روپیہ اس طرح ضائع نہیں کیا جاسکتا،

فرض کرو ایک شہر میں بہت سی مسجدیں موجود ہیں، لیکن انگریزی تعلیم (جو تحصیل معاش کا ذریعہ ہے) اس کا سامان بالکل نہ ہو، اب ایک شخص ایک مسجد اور دوسرا شخص انگریزی مدرسہ بنائے تو تم کس کام کو ترجیح دو گے ؟

شیخ کی نکتہ سنجی پر حیرت ہوتی ہے جب نظر آتا ہے کہ وہ مذہبی جوش اور غلو کیساتھ حقیقت شناسی سے کبھی الگ نہیں ہوتا، ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بادشاہ نے روزہ رکھا باورچی کی بیوی نے کہا سلطان کو اس روزہ سے کیا ثواب ہوگا کہ ہم سب بھوکے مرینگے

کہ سلطان ازیں روزہ گوئی چہ خواست　　　که افطار او عید طفلان ماست

شیخ اس مسئلہ کو زیادہ روشن کرنے کے لئے خود اپنی زبان سے کہتا ہے،

خورندہ کہ خیرش برآید زدست　　　به از صائم الدہر دنیا پرست
مُسلّم کسے را بود روزہ داشت　　　که درماندۂ را دہد نان چاشت
دگرنہ چہ حاجت کہ زحمت بری　　　زخود بازداری وہم خود خوری
خیالات نادان خلوت نشین،　　　بہم برکند عاقبت کفر و دین

اخیر شعر میں کہتا ہے کہ سادہ دل خلوت نشین مذہب کو خراب کر دیتا ہے،

ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش نے حج کا سفر کیا اور ہر ہر قدم پر دو دو رکعتیں نماز پڑھتا جاتا تھا، اس ریاضت شاقہ پر اس کو دل میں غرور پیدا ہوا، ہاتف غیب نے آواز دی کہ ایک دل کو خوش کرنا ہزار رکعت سے بہتر ہے،

به احسانے آسودہ کردن دلے　　　به از الف رکعت بہر منزلے

ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ کثیر جو ہمہ تن ریاکار ہے ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کر سکتا،

شیخ اس راز سے خوب واقف تھا، اس لئے اس نے نہایت دلیری سے اس طلسم کو توڑا،
غزلوں میں نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے،

برون نمیرود از خانقہ یکے ہشیار | کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیان مستند

محتسب در قفائے رنداں است | غافل از صوفیان شاہد باز

بوستان میں ایک شخص کی زبان سے ان لوگوں کی پوری تصویر کھینچی ہے،

کہ زنہار ازیں مردمان خموش | پلنگان درندۂ صوف پوش

کہ چوں گربہ زانو بہم برزنند | وگر صیدے افتد چو سگ درجہند

سوے مسجد آوردہ دکان شید | کہ در خانہ کمتر توان یافت صید

سپید و سیہ پارہ بردوختہ | بر سالوس پنہان زر اندوختہ

زہے جو فروشان گندم نمائے | جہان گرد و سالوس و خرمن گدائے

مبین در عبادت کہ پیرند و سُست | کہ در رقص و حالت جوانند و چُست

عصائے کلیم اند بسیار خوار | بہ ظاہر چنیں زرد روے و نزار

ز سنت نہ بینی در ایشاں اثر | بجز خواب پیشین و نان سحر

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شیخ نے اخلاق کی بنیاد بے تعصبی پر قائم کی، اُس نے مختلف طریقوں سے بے تعصبی کی تعلیم دی ہے اور جتایا ہے کہ تعصب کے ساتھ اخلاق کا لطیف اور نازک حاسہ قائم نہیں رہ سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر سے جو برتاؤ کیا تھا اس کی نسبت وحی کے ذریعہ سے ان کو خدا نے تنبیہ کی کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں، اس حکایت سے شیخ کو یہ جتانا تھا کہ معاشرت اور حسن اخلاق میں کافر و مسلم کی تمیز نہیں، شیخ عموماً ہر مذہب و ملت کے بڑے لوگوں کا نام جب لیتا ہے تو ادب سے لیتا ہے، دارا

آتش پرست تھا تاہم شیخ کہتا ہے،

شنیدم کہ دارائے فرخ تبار ز لشکر جدا ماند روز شکار

نوشیروان کے زمانہ میں پیدا ہونے پر رسول اللہ کا ناز کرنا ثابت کرتا ہے،

سزد گر بدورش بنازم چناں کہ سید بدوران نوشیروان

خود سُنی اور پکا سُنی تھا (علی رغم الف قاضی نور اللہ) لیکن فردوسی کا نام (جو قطعاً شیعہ تھا) اس طرح لیتا ہے

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد کہ رحمت بر آں تربت پاک باد

کیا آج کوئی روشن خیال سے روشنخیال سنی عالم، کسی شیعہ کی تربت کو پاک اور اُس کی نسبت رحمت کی دعا کرسکتا ہے،

شیخ نے اگرچہ فلسفہ اخلاق، کو شاعرانہ انداز میں لکھا لیکن مسائل اخلاق کے متعلق بہت سے ایسے نازک، دقیق، اور لطیف دلائل اور جو بیان کئے کہ اخلاق کی فلسفیانہ تصنیفات میں بھی نہیں مل سکتے، کبر، حسد، غیبت وغیرہ خباثت نفسانی کی بُرائیوں کے وجوہ تمام کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن شیخ ان سب سے الگ دقیق باتیں کرتا ہے، بدگوئی کی بُرائی کی نسبت کہتا ہے،

باریک

بد اندر حق مردم نیک و بد مگوائے جوان مرد صاحب خرد

کہ بد مرد را خصم خود میکنی دگر نیک مرد است بد مے کنی

یعنی بدگوئی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ جس کی بدگوئی کروگے دو صورت سے خالی نہیں، اگر وہ اچھا آدمی ہے، تو اچھے آدمی کو بُرا کہنا مناسب نہیں، اور بُرا ہے تو بُرے آدمی کو اپنا دشمن بنا لینا اچھا نہیں، یہ ظاہر ہے کہ بُرا آدمی کسی کی دشمنی کرتا ہے تو جائز ناجائز کی پروا نہیں کرتا

اس لیئے بڑے آدمی کو اپنا دشمن بنانا اپنے آپ کو بلا میں پھنسانا ہے، یہ تقسیم اور استدلال جس قدر فلسفیانہ ہے اُسی قدر واقعی اور عملی ہے،

یا مثلاً خاموشی کی خوبیاں تمام اخلاقی کتابوں میں مختلف طریقوں سے بیان کی ہیں لیکن **شیخ** سب سے الگ فلسفیانہ طریقہ سے اس کو ثابت کرتا ہے،

ترا خامشی اے خداوند ہوش ۔۔۔ وقار است و نا اہل را پردہ پوش

اگر عالمی ہیبت خود مبر ۔۔۔ و گر جاہلی پردۂ خود مدر

یعنی **خاموشی**، عالم و جاہل دونوں کے لئے مفید ہے، عالم کا تو وقار بڑھتا ہے اور جاہل کا پردہ ڈھکا رہتا ہے،

یا مثلاً دوسروں کے اعتراض اور نکتہ چینی کا بُرا نہ ماننا اور اس کو گوارا کرنا اس کو **شیخ** اس طرح دلنشین کرتا ہے،

گر آنی کہ دشمنت گوید مرنج ۔۔۔ ور آں نیستی گو، برو باد سنج

یعنی دو حال سے خالی نہیں، یا جو اعتراض دشمن کرتا ہے واقعی ہے تو واقعی اور سچی بات کا بُرا ماننا کیا؟ اور جھوٹ اور غلط کہتا ہے تو جھوٹے بات کا کیا رنج، اس کو بکنے دو،

یا مثلاً بدمزاج اور بداخلاق زُہّاد کی نسبت لکھتا ہے،

نہ خورد از عبادت بر آں بیخرد ۔۔۔ کہ با حق نکو بود و با خلق بد

یعنی اس شخص نے عبادت کا پھل نہیں چکھا جو خدا کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا اور مخلوقات کے ساتھ بُرائی سے، یہاں یہ دقیق نکتہ بتایا ہے کہ کج خلق عابد جو عبادت کرتے ہیں، اُن کی عبادت، اصلی نیکی اور دل کے اقتضاء سے نہیں ہوتی، بلکہ سزا اور عقاب کے ڈر سے ہوتی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس سے اُن کو اس قسم کا اندیشہ نہیں، (بندگان خدا سے)

اُس سے وہ کج اخلاقی اور بدمزاجی اور دل آزاری کا برتاؤ کرتے ہیں،

شیخ نہایت سرسری اور معمولی واقعات سے جو رات دن لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں، نہایت دقیق نکتے پیدا کرتا ہے، مثلاً چھوٹے بچوں کو لوگ میلے ٹھیلے میں ساتھ لے جاتے ہیں تو اُس کے ہاتھ میں دامن دے دیتے ہیں کہ ہجوم میں کہیں بھاگ نہ جائے،

شیخ کو بچپن میں یہ واقعہ پیش آیا تھا،

شیخ نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا،

ہمے یاد دارم ز عہد صغر | کہ عیدے برون آمدم با پدر
بہ بازیچہ مشغولِ مردم شدم | در آشوب خلق از پدر گم شدم
بر آوردم از بیقراری خروش | پدر ناگہانم بمالید گوش
کہ اے شوخ چشم آخرت چند بار | نگفتم کہ دستت ز دامن مدار
تو ہم طفل راہی بہ سعی اے فقیر | برو دامن نیک مردان بگیر

یعنی جو شخص، راہ سلوک کی ابتدائی منزلوں میں ہے وہ بچہ ہے اس لئے اُس کو مرشد کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے،

تم نے دیکھا ہوگا کہ بلی اپنے فضلہ کو خاک میں چھپا دیتی ہے تم کو کچھ خیال بھی نہ آیا ہوگا لیکن شیخ اس مبتذل واقعہ سے کس قدر پُر اثر اخلاقی نتیجہ استنباط کرتا ہے،

پلیدے کند گربہ بر جائے خاک | چو زشتش نماید بپوشد بہ خاک
تو آزادی از ناپسندیدہ ہا | نہ ترسی کہ بروے فتد دیدہ ہا

یعنی بلی کو اتنا خیال ہے کہ وہ اپنے فضلہ کو جو بدنما معلوم ہوتا ہے، چھپا دیتی ہے تم ہزاروں بُرائیاں کرتے ہو اور لوگ دیکھتے ہیں اور تم کو شرم نہیں آتی،

ایک شخص کیچڑ میں لتھڑا ہوا مسجد میں جانے لگا، موذن نے ڈانٹا کہ نجاست کے ساتھ ایسی پاک جگہ میں جاتا ہے شیخ پر اس کا اثر جو ہوا وہ یہ تھا،

گِل آلودہ راہ مسجد گرفت ... زبخت نگون طالع اندر شگفت
یکے زجر کردش کہ تبت یدا لک ... مرو دامن آلودہ در جائے پاک
مرا رقتے در دل آمد بریں ... کہ پاک است و خرم بہشت بریں
دراں جائے پاکان امیدوار ... گِل آلودہ معصیت را چہ کار

بچپن میں شیخ کے والد نے شیخ کو انگوٹھی خرید کر دی کسی عیار نے مٹھائی کا لالچ دیا، ان کو انگوٹھی کی کیا قدر تھی، مٹھائی لیکر انگوٹھی دے دی، یہ واقعے عموماً پیش آتے ہیں شیخ اس سے کس قدر عظیم الشان نتیجہ پیدا کرتا ہے،

بدر کرد ناگہ یکے مشتری ... بہ شیرینی از دستم انگشتری
چو نشناسد انگشتری طفل خُرد ... بہ شیرینی از وے تواند بُرد
تو ہم قیمت عمر نشناختی ... کہ در عیش شیرین برانداختی

لطف و احسان کا اثر ایک معمولی واقعہ سے اس طرح ثابت کرتے ہیں،

بہ راہ بر یکے پیشم آمد جوان ... بہ تگ در پیش گوسفندے دوان
بدو گفتم ایں ریسمان است و بند ... کہ مے آید اندر پیت گوسفند
سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد ... چپ و راست پوئیدن آغاز کرد
چو باز آمد از عیش و شادی بجائے ... مرا دید و گفت اے خداوند رائے
نہ ایں ریسمان مے برد با منش ... کہ احسان کمند بست در گردنش

ایک درویش کو کتے نے پاؤں میں کاٹ لیا، زخم کی تکلیف سے رات بھر وہ کراہا کیا اُس

کی ایک کمسن لڑکی تھی، اُس نے کہا آبا! پھر آپ نے کیوں نہیں کُتّے کو کاٹا کہ برابر سرابر ہو جاتے درویش نے کہا جان من! میرے دانت کتے کے قابل نہ تھے، شیخ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے، کہ تم کو اگر کوئی نااہل بُرا کہے اور تم بھی اُس کو بُرا کہو تو اُس کی یہی مثال ہوگی کہ آدمی کُتّے کو کاٹنا چاہے،

محال است اگر تیغ بر سر خورم — کہ دندان بپاے سگ اندر برم

تواں کرد با ناکسان بدرگی — ولیکن نیاید ز مردم سگی

شیخ کی انتہاے قوت تخیل کا اندازہ، اُن فرضی حکایتوں سے ہو سکتا ہے جو محض اس کی قوت تخیل کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جن کو وہ واقعیت اور حسن استدلال کا مجموعہ بنا دیتا ہے مثلاً

یکے قطرہ باران ز ابرے چکید — خجل شد چو پہناے دریا بدید

کہ جاے کہ دریاست من کیستم — گر او ہست، حقا کہ من نیستم

چو خود را بچشم حقارت بدید — صدف در کنارش بجان پرورید

سپہرش بجاے رسانید کار — کہ شد نامور لو لوے شاہوار

یعنی بادل سے ایک قطرہ ٹپکا، دریا کا پاٹ دیکھ کر شرمایا کہ اس کے آگے میری کیا حقیقت ہے، چونکہ اُس نے اپنے آپ کو حقیر سمجھا، سیپ نے اس کو اپنی گود میں لیا، چند روز کے بعد دیکھا تو وہی قطرہ گوہر شاہوار تھا،

یا مثلاً

گلے خوشبوے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوے دل آویز تو مستم

بگفتا من گلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گُل نشستم

جمال ہمنشین در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یا مثلاً زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک بگوشش آمدم نالۂ دردناک

کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر کہ چشم و بنا گوش و روے ست و سر

یعنی میں نے ایک دن ایک خاک کے ٹیلہ پر پھاوڑا مارا، اُس سے آواز آئی کہ میاں اگر تم میں آدمیت اور غیرت ہے تو ذرا آہستہ، کیونکہ یہ سب آنکھیں اور کان اور چہرے اور سر ہیں،

(یعنی آج جو خاک ہے یہ پہلے انسان کی اعضا تھے جو بوسیدہ ہوکر خاک ہوگئے)

یا مثلاً نگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ بتابد بہ شب کرمکے چون چراغ

یکے گفتش اے مرغکِ شب فروز چہ بودت؟ کہ بیرون نیائی بروز

ببین کاتشین کرمک خاک زاد جواب از سرِ روشنائی چہ داد

کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم ولے پیش خورشید پیدا نیم

یا مثلاً

شبے یاد دارم کہ چشمم نہ خفت شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت

کہ من عاشقم گر بسوزم رواست ترا گریہ و سوز بارے چراست

بگفت اے ہوادار مسکین من برفت از برم یار شیرین من

تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام من استادہ ام تا بسوزم تمام

ترا آتش عشق اگر پر بسوخت مرا بین کہ از پاے تا سر بسوخت

پیرایۂ ادا

شیخ کی کمال شاعری کا اصلی معیار، اُس کا پیرایۂ ادا ہے، اس سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ کس مضمون کے موثر کرنے کا سب سے بڑھ کر، کونسا طریقہ ہے جن جن مضامین کو اُس نے لیا ہے، اُن کو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے متقدمین

اور متاخرین میں اس کی نظیر مطلق نہیں مل سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اخلاق میں سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، صرف ایک مخزن الاسرار نظامی کے طرز پر ۶۵ مثنویاں لکھی گئیں اور سب کی سب، اخلاق و تصوف میں ہیں، لیکن بوستان اور گلستان کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا چند مثالوں سے تم اس کا اندازہ کر سکتے ہو،

مثلاً دولت و حکومت کی تنقیص، ایک پامال مضمون ہے جو سینکڑوں دفعہ لوگ مختلف پیرایوں میں ادا کر چکے ہیں، لیکن شیخ کا صرف ایک شعر سب پر بھاری ہے،

گدا را کند یک درم سیم سیر فریدوں بہ ملک عجم نیم سیر

شیخ نے اس کے ساتھ فلسفیانہ طریقہ سے ثابت کر دیا ہے کہ دولتمندی درحقیقت محتاجی ہے،

خبر دہ بہ درویش سلطان پرست کہ سلطان ز درویش مسکین ترست

نگہبانی ملک و دولت بلا است گدا بادشاہ است و نامش گدا است

بخسپند خوش روستائی و جفت بہ ذوقے کہ سلطان در ایوان نہ خفت

دہقان بیوی

اسی مضمون کو ایک مصرع میں ادا کیا ہے

ع آنانکہ غنی تراند محتاج تراند،

یہ ظاہر ہے کہ انسان جس قدر دولتمند اور امیر ہوتا جاتا ہے، اُس کی ضرورتیں اور حاجتیں بڑھتی جاتی ہیں، اس لئے زیادہ دولتمندی درحقیقت زیادہ محتاجی ہے،

یا مثلاً یہ تلقین کرنا تھا کہ دولتمندوں کو، غریبوں پر رحم کرنا چاہئے، اس کو شیخ نے اس حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا،

ملک صالح از بادشاہان شام بروں آمدے صبحدم با غلام

بگشتے در اطراف بازار و کوی
بہ رسم عرب نیمہ بر بستہ روی

دو درویش در مسجدے خفتہ یافت
پریشان دل و خاطر آشفتہ یافت

یکے زاں دو مے گفت با دیگرے
کہ ہم روز محشر بود داورے

گر ایں بادشاہاں گردن فراز
کہ با لہو و عیش اند و با کام و ناز

در آیند با عاجزاں در بہشت
من از گور سر بر نگیرم ز خشت

بہشت بریں ملک و ماوائے ماست
کہ بند غم امروز بر پائے ماست

اگر صالح آں جا بہ دیوار باغ
در آید بہ کفشش بدرّم دماغ

حکایت کا ما حصل یہ ہے کہ ملک صالح (شام کا بادشاہ) اور سلطان صلاح الدین کے خاندان سے تھا، ایک دن شہر کے گشت کو نکلا، دو فقیر ایک مسجد میں لیٹے تھے، اور جاڑے اور بھوک کی تکلیف سے بیتاب تھے، ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ آخر قیامت میں بھی کوئی حاکم ہوگا، اگر یہ بادشاہ لوگ جو دنیا میں مزے اُڑاتے پھرتے ہیں، ہم غریبوں کے ساتھ بہشت میں داخل ہوں گے تو میں قبر سے سر نہ اُٹھاؤں گا، بہشت ہمارا حصّہ ہے کہ ہم آج مصیبتیں بھر رہے ہیں، صالح اگر وہاں بہشت کی دیوار کے پاس بھی آیا تو اس کا سر توڑ دوں گا،

دولتمندوں کو غریبوں پر رحم دلانے کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ تکلیف کی حالت میں غریبوں کو امیروں کی ناز و نعمت پر جو رشک، جلن اور غصہ پیدا ہوتا ہے، اس کو دکھایا جائے شیخ نے اُس کی نہایت صحیح تصویر کھینچی، اخیر کا شعر باوجود اس کے کہ تہذیب کی حد سے بڑھا ہوا ہے واقعیت اور اصلیت کی اصلی تصویر ہے، لیکن شیخ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بادشاہ کی فیاضانہ طرز عمل کو بھی دکھایا،

روان ہر دو کس را فرستاد و خواند | بہ ہیبت نشست و بہ حرمت نشاند
بر ایشاں بباریدہ باران جود | فروشست شان گرد ذل از وجود
شہنشہ ز شادی چو گل بر شگفت | بخندید و در روئے درویش گفت
من آں کس نیم کز غرور حشم، | ز بیچارگان روے در ہم کشم
من امروز کردم، در صلح باز | تو فردا مکن، در بروئیم فراز

یعنی بادشاہ نے اُن فقیروں کی مہمانی اور حاجت روائی کرکے کہا کہ آج میں آپ لوگوں کے ساتھ عاجزی اور دوستی کا برتاؤ کرتا ہوں، آپ بھی میرے ساتھ قیامت میں مہربانی کیجئے گا اور مجھ کو بہشت میں آنے سے نہ روکئے گا،

سننے والے پر فقیروں کے غم اور غصہ سے جو اثر پیدا تھا وہ بادشاہ کے شریفانہ طرز عمل اور حکیمانہ جواب سے کس قدر اور زیادہ قوی ہو گیا۔ ممکن نہیں کہ ایک دردمند دل اس کو پڑھے اور اس کے آنسو نکل نہ آئیں،

با مثلاً غیبت کی بُرائی کو، لوگوں نے مختلف پیرایوں میں ادا کیا تھا شیخ نے سب سے زیادہ اچھوتے لیکن نہایت موثر طریقہ سے اس حکایت کے پیرایہ میں اس مضمون کو ادا کیا،

طریقت شناسانِ ثابت قدم | بخلوت نشستند چندے بہم
یکے زاں میان غیبت آغاز کرد | در ذکر بیچارۂ باز کرد
کسے گفتش اے یار شوریدہ رنگ | تو ہرگز غزا کردۂ در فرنگ
بگفت از پس چار دیوار خویش | ہمہ عمر (کبھی) ننہادہ ام پاے پیش
چنیں گفت درویش صادق نفس | ندیدم چنیں بخت برگشتہ کس
کہ کافر زپیکارش ایمن نشست | مسلمان زجور زبانش نہ رست

یعنی چند آدمی ایک صحبت میں شریک تھے، ایک شخص نے کسی کی غیبت شروع کی، ایک نیک نفس نے کہا کہ کیوں یار! کبھی تم نے کافروں سے لڑائی بھی کی ہے، اُس نے کہا میں نے تو کبھی، گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالا، نیک نفس نے کہا سبحان اللہ! کافر تو آپ کے حملہ سے محفوظ رہا۔ لیکن مسلمان، آپ کی تیغ زبان سے نہ بچ سکا، ایک اور طریقہ سے اسی مضمون کو ادا کیا ہے،

زبان کرد شخصے بغیبت دراز　　بدو گفت دانندۂ سرفراز
کہ یاد کسان، پیش من بد مکن　　مرا بد گمان در حق خود مکن

زیادہ گوئی کی بُرائی نہایت پامال مضمون ہے شیخ اس مضمون کو کس قدر عجیب اسلوب سے ادا کرتا ہے،

کمال است در نفس انسان سخن　　تو خود را بہ گفتار ناقص مکن

یعنی قوت ناطقہ ہی انسان کا سب سے بڑا کمال ہے، ایسا نہ کرو کہ یہی وصف زیادہ گوئی کی وجہ سے تمہارے نقصان کا سبب قرار پائے،

کم آواز ہرگز نہ بینی خجل　　جوے مشک بہتر کہ یک تودہ گل
حذر کن زناداں دہ مردہ گوی　　چو دانا یکے گوی و پروردہ گوی
صد انداختی تیر، و ہر صد خطا است　　اگر ہوشمندی یک انداز و راست

یعنی سینکڑوں تیر تم نے نشانہ پر لگائے اور سب خالی گئے اگر عقلمند ہو تو ایک تیر لگاؤ لیکن ٹھیک نشانہ پر لگاؤ،

مناجات، تضرّع، استغفار اور توبہ فی نفسہٖ ایک موثر مضمون ہے لیکن شیخ نے اس کو ایک حکایت کے پیرایہ میں کس قدر اور زیادہ موثر کر دیا ہے،

شنیدم کہ مستی ز تاب نبید
به مقصورهٔ عابدے بر دوید

بنالید بر آستان کرم
کہ یارب بہ فردوس اعلےٰ برم

مؤذن گریبان گرفتش کہ ہیں
سگ و مسجد اے فارغ از عقل و دیں

چہ شائستہ کردی کہ خواہی بہشت
نمے زیبدت ناز باروے زشت

بگفت ایں سخن پیر و گریست مست
کہ مستم بدار از من اے خواجہ دست

عجب داری از لطف پروردگار
کہ باشد گنہگارے امیدوار

ترا مے نگویم کہ عذرم پذیر
در توبہ بازاست و حق دستگیر

ہمے شرم دارم ز لطف کریم
کہ خواہم گنہ پیش عفوش عظیم

یعنی ایک مست نشہ کے زور میں مسجد میں گھس گیا اور رو کر پکارا کہ اے خدا مجھ کو بہشت میں لے جا تا موذن نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا کہ او سگ نجس! مسجد میں تیرا کیا کام، تو نے کون اچھا عمل کیا ہے کہ بہشت کا دعوے ہے، مست رو پڑا اور بولا کہ کیا آپ کو خدا کے لطف عمیم سے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس کی مغفرت کا امیدوار ہو، میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور خدا دستگیر ہے مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں،

غور کرو شیخ نے اس مضمون کے مؤثر کرنے کے لئے بلاغت کے کن نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے، سب سے پہلے یہ کہ مناجات میں براہ راست خدا کو مخاطب نہیں کیا، کیونکہ انسان کسی شخص کو جب مخاطب کر کے اس کی مدح، یا اس کی نسبت، حسن ظن ظاہر کرتا ہے تو اس میں ظاہرداری اور خوشامد کے شائبہ کا احتمال ہوتا ہے، یہی نکتہ ہے کہ سورۃ الحمد میں خدا کی حمد، صیغہ غائب سے ادا کی ہے، مؤذن کی ڈانٹ بتانے سے، مناجات مانگنے

والے کی نسبت دل میں رحم کا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس سے اس کی نہایت مظلومی اور دشمن کی بے رحمی ظاہر ہوتی ہے اب اس کا یہ جواب کہ میں آپ سے تو رحم کا خواستگار نہیں، مجھ کو جس سے امید ہے، وہ اور ہی کریم النفس ذات ہے مناجات کے قبول کے لئے کس قدر موثر ہے، یہ قاعدہ ہے، کہ کوئی شخص اگر کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی مہربانی اور رحم پر اپنا بھروسہ ظاہر کرے تو اس شخص کو خواہ مخواہ اس کی شرم اور اس کا پاس ہوگا، ان باتوں کی مجموعی ترتیب نے مناجات اور طلب مغفرت کے مضمون کو نہایت موثر کر دیا ہے،

ہم نے اطناب کے ڈر سے صرف چند مثالوں پر قناعت کی، عموماً جن مضامین کو شیخ نے ادا کیا ہے، اُن کا مقابلہ، اور شعرا اور مصنفین سے کرو تو صاف نظر آئے گا کہ شیخ کو اس خصوصیت میں کیا ترجیح حاصل ہے،

مناظر قدرت اس قسم کے مضامین میں بہار کا مضمون سب سے زیادہ پامال ہے اور اب تک پامال ہوتا آتا ہے لیکن شیخ کے قصیدہ کا اب تک جواب نہ ہو سکا،

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار — خوش بود دامن صحرا و تماشائے بہار
(یعنی دن اور رات برابر ہو گئے)

آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب — سرو در باغ بہ رقص آمدہ و بید و چنار

باش تا غنچۂ سیراب، دہن باز کند — بامداداں چو سر نافۂ آہوئے تتار

باد گیسوئے عروسان چمن، شانہ کند — بوئے نسرین و قرنفل برود در اقطار

ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر — راست چوں عارض گلبوئے عرق کردۂ یار
(شبنم)

ارغوان ریختہ، بر درگہ خضرائے چمن — ہم چناں است کہ بر تختۂ دیبا، دینار

ایں ہنوز اول آذار جہاں افروزی است — باش تا خیمہ زند، دولت نیسان و ایار
(بہار کے مہینے میں)

شاخہا دختر دوشیزۂ باغ اند ہنوز — باش تا حاملہ گردند بہ الوان ثمار
(رنگ برنگ کے پھل)

تا نہ تاریک شود سایۂ انبوہ درخت | زیر ہر برگ چراغے بنہند از گل نار
سیب را ہر طرفے داد طبیعت رنگے | ہم بداں گونہ کہ گلگونہ کند بوسے نگار
گو نظر باز کن و خلقت نارنج ببین | ایکہ باور نہ کنی فی الشجر الاخضر نار
آب در پاے ترنج و بہ و بادام روان | ہم چو در زیر درختان بہشتی انہار

غزل یہ عموماً مسلم ہے کہ شیخ غزل کے ابوالآباء ہیں، قدماء تو سرے سے غزل کہتے نہ تھے قصائد کے ابتدا میں عرب کے طرز پر جو تشبیب کہتے تھے، یہی اُس زمانہ کی غزل تھی متاخرین قدماء مثلاً انوری، ظہیر وغیرہ نے قصیدہ سے الگ کرکے غزلیں لکھیں لیکن ان میں کسی قسم کا اثر، اور کسی قسم کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی نہ تھی، البتہ چونکہ زمانہ کی امتداد سے قدرتی طور پر زبان خود روز بروز سادہ اور صاف ہوتی جاتی تھی اس لئے غزل کی صفائی اور سادگی بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی، کمال اسمعیل کے غزل کا نمونہ اوپر گذر چکا، اس زمانہ کے اور شعراء کی سادگی کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا،

غزل (از محمد بن نصیر)

گل کہ شایان بادہ بود، رسید | آمدن وعدہ دادہ بود، رسید
جنگ لالہ گذشت و لشکر گل | گرچہ پس تر فتادہ بود، رسید
سرو آزاد، بہر سوسن را است | منتظر ایستادہ بود، رسید
لالہ رفت، ارچہ پائے در گل بود | گل اگرچہ پیادہ بود، رسید

دیگر (از صفی)

چہ در داست این کہ عشقش نام کردند | در وآشوب، خاص و عام کردند
ہر آنچہ اندر زمانہ درد و دل بود | یکے کردند و عشقش، نام کردند

خراباتے است اندر عشق کان جا
زخون دل، مے اندر جام کردند

بیک[1] ساغر دران بت خانہ مارا
چنیں سرمست و بے آرام کردند

دیگر

فتنہ ہا بر دلم انبار مکن، گو نہ کنم
بار ہا کردہ اینکار، مکن، گو نہ کنم

شیخ کو سادگی اور صفائی کے متعلق کچھ کوشش نہیں کرنی پڑی، جو زبان انکے زمانہ میں موجود تھی پہلے ہی منجھ چکی تھی، شیخ نے جو باتیں غزل میں پیدا کیں، حسب ذیل ہیں،

(۱) شیخ کے زمانہ سے پہلے جو شعرا گزرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے، ان میں سے بعضوں نے تو سرے سے عشق کو ہات بھی نہیں لگایا تھا، بعضوں نے حسن سخن کے لئے اُس سے کام لیا، لیکن وہ نرے الفاظ ہی الفاظ تھے، اندر کچھ نہ تھا، شیخ کے زمانہ میں قوم کے شجاعانہ جذبات فنا ہو چکے تھے، اس لئے زندگی کا جو کچھ سہارا رہ گیا تھا یہی عشق و عاشقی تھی، حُسن اتفاق سے شیخ میں یہ جذبہ فطری تھا اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیوی تعلقات سے آزاد رہا اس لئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مشتعل رہی، اسی آگ کے شعلے ہیں جو اس کی زبان سے نکلتے ہیں، اُس نے معشوقوں کے جور و ستم اور بے مہری اور بیوفائی کے جان گداز صدمے اُٹھائے ہیں، اسلئے اُسکا سینہ، درد اور سوز و گداز کا آتشکدہ ہے، اشعار ذیل سے اس کا اندازہ کرو،

خبر ما برسانید بہ مرغانِ چمن
کہ ہم آواز شما در قفسے افتادہ است

گر دلے داری بہ دلدارے سپار
ضائع آں کشور کہ سلطانیش نیست

ماجرائے عقل پرسیدم ز عشق
گفت معزول است و فرمانیش نیست

---

[1] یہ سب غزلیں لب اللباب عوفی یزدی میں موجود ہیں،

گفتم کہ عشق را بہ صبوری دوا کنم — ہر روز عشق بیشتر و صبر کمتر است

بہ خشم رفتہ ما را کہ مے برد پیغام؟ — بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

ہمہ از دست غیر نالہ کنند — سعدی از دست خویشتن فریاد

در سوختہ پنہاں نتواں داشتن آتش — ما ہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد

گفتمش سیر بہ بینم مگر از دل برود — آں چناں جائے گرفتست کہ مشکل برود

دلے از سنگ بباید بسر راہ وداع — کہ تحمل کند آں لحظہ کہ محمل برود

ندانمت ز کجا آں سپر بدست آری — کہ تیر آہ مرا ز آسمان بگردانی

حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر — بسر نہ کوفتہ باشد در سرائے را

سعدیا! ایں ہمہ فریاد تو بے چیزے نیست — آتشے ہست کہ دود از سر آں مے آید

سعدیا! نوبتے امشب دہل صبح نہ کوفت — یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

دو دوست قدر شناسند روز صحبت را — کہ مدتے ببریدند و باز پیوستند

ایکہ گفتی مرو اندر پے خونخوارۂ خویش — با کسے گوی کہ در دست عنانے دارد

(۲) شیخ سے پہلے عشق کے واردات اور معاملات نہیں بیان کرتے تھے شیخ پہلا شخص ہے، جس نے اس کی ابتدا کی، خسرو، شرف جہان قزوینی نے اس کو ترقی دی اور وحشی یزدی پر اس طرز کا خاتمہ ہو گیا،

بوسہ از لب جان بخش بدہ یا بستان — کایں متاعے است کہ بخشند و بہا[1] نیز کنند

امشب مگر بہ وقت نمے خواند ایں خروس — عشاق بس نہ کردہ ہنوز از کنار و بوس

تا نشنوی ز مسجد آدینہ بانگ صبح — یا از در سرائے اتابک غریو کوس

---

[1] بہا کردن، قیمت لینا۔

لب از لب چو چشم خروس ابلہی بود	بر داشتن بہ گفتن بیہودہ خروس
مرا راحت از زندگی دوش بود	کہ آں ماہ رویم در آغوش بود
ندانستم از غایت لطف و حسن	کہ سیم و سمن یا برو دوش بود
بدیدار و گفتار جان پرورش	سراپائے من دیدہ و گوش بود
مؤذن غلط گفت بانگ نماز (اذان ۱۲)	مگر ہمچو من مست و مدہوش بود
سرمست بتے لطیف و سادہ	در دست گرفتہ جام بادہ
در مجلس بزم بادہ نوشان	بستہ کمر و قبا کشادہ
لعلش چو عقیق گوہر آگین	زلفش چو کمند تاب دادہ
بنشستہ زمین بہ حضرت وے	گردونش بہ بندگی ستادہ
دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست	تا ندانند حریفان تو منظور منی

۳۔ شیخ کی غزلوں کے حسن قبول کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جو خیالات ادا کرتا ہے عموماً وہ ہوتے ہیں جو عموماً عشاق اور ہوس پیشہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اس بنا پر جب اس مذاق کے لوگ اُن اشعار کو سُنتے ہیں تو اُن کو نظر آتا ہے کہ کوئی شخص اُن ہی کے خیالات کی سفارت کر رہا ہے، اور ایسے دلنشین اور مؤثر طریقہ سے کر رہا ہے کہ وہ خود نہیں کر سکتے تھے، مثلاً عشق پر ملامت کرنے کے وقت عاشق کے دل میں عموماً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی بدعت نہیں سبھی اس مرض میں مبتلا ہیں، اور اچھی صورت کی طرف دل کا نہ کھچنا ہو بھی تو نہیں ہو سکتا شیخ اسی خیال کو نہایت برجستگی اور صفائی سے ادا کرتا ہے

عشق بازی نہ من آخر بہ جہان آوردم	یا گناہے است کہ اول من مسکین کردم
گر کند میل بہ خوبان، دل من خردہ مگیر	کین گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

رفیق و مہربان و یار ہمدم | ہمہ کس دوست میدارند و من ہم
نظر بر نیکوان رسمے است معہود | نہ این بدعت من آوردم بہ عالم
تو گر دعوے کنی پرہیزگاری | مصدق دانمت واللہ اعلم
وگر گوئی کہ میل خاطرم نیست | من این دعوے نمیدارم مسلم
حدیث عشق، اگر گوئی گناہ است | گناہ اوّل ز حوا بود و آدم

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اس شعر کی بلاغت پر لحاظ کرو، کہنا یہ تھا کہ لوگ مجھ کو عاشقی سے منع کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ معشوق کا حسن ہی ایسا دلفریب ہے کہ دل قابو میں نہیں رہ سکتا۔

اس بات کو کہ معشوق کا حسن نظر فریب ہے، یوں ادا کیا کہ یہ معشوق سے پوچھنا چاہیے کہ وہ اس قدر حسین کیوں ہے؟ اس طرزادا میں پھر یہ جدت کہ خود معشوق کو مخاطب بنایا اور یہ کہا کہ یہ تو تجھ سے پوچھنا چاہیے کہ تو اس قدر حسین کیوں ہے؟ معشوق کے حسن کی تعریف، خود اُس کے منہ پر، اس کا پہلو اس سے بڑھ کر کیا لطیف اور دلاویز ہو سکتا ہے،

۴- شیخ پہلا شخص ہے جس نے غزل میں، زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریاکاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے خیام نے رباعیوں میں اس مضمون کو ادا کیا تھا، لیکن صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں شیخ کی طرح چھپی اور چبھتی ہوئی چوٹیں نہ تھیں جن سے ریاکاروں کے دل برما جائیں،

محتسب در قفاے رنداں است | غافل از صوفیان شاہد باز

یعنی محتسب رندوں کا تعاقب کرتا پھرتا ہے، لیکن شاہد باز صوفیوں کی اس کو خبر تک نہیں کہ یہ چھپ چھپ کر کیا کرتے ہیں،

بروں نے رو داز خانقہ بیکے ہوشیار — کہ پیش شحنہ، بگوید کہ صوفیان مستند
گر کند میل بر خوباں دل من خردہ مگیر — کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس مضمون کو خواجہ حافظ نے اس قدر پھیلایا کہ خاص ان کا ہوگیا اصل بنیاد شیخ نے قائم کی،

اے محتسب از جوان چہ پرسی — من تو بہ نے کنم کہ پیرم

اس شعر میں، اوروں کے بجائے خود اپنے آپ کو ملزم قرار دیا ہے اور یہ بلاغت کا خاص پہلو ہے

ہیچ کس بے دامن تر نیست آمادیگران — بازی پوشندو ما در آفتاب افگندہ ایم

۵- مدح، ذم، رزم، مرثیہ، غرض جس قدر انواع مضامین ہیں، اگرچہ ان پر ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار مل سکتے ہیں لیکن اساس مضامین چند ہی ہوتے ہیں، اُن ہی کو سو سو طرح اُلٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں، اس لئے اصلی شاعری کا حق دار وہی ہے جس نے یہ بنیادیں قائم کی ہوں، شیخ کے بعد اگرچہ غزل کو بہت ترقی ہوئی اور خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اس قدر بلند کر دیا کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرز خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی مثلاً،

سعدی	حافظ
اے بلبل اگر نالی، من با تو ہم آوازم	بنال بلبل، اگر بامنت سر یاری است
تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے	کہ ما دو عاشق زاریم دکار ما زاری است
فریاد دوستاں ہمہ از دست دشمن است	من از بیگانگان ہرگز ننالم

فریاد سعدی از دل نامہربان دوست — کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

گ

گر کنند میل بخوباں دل من خردہ مگیر — من اگرچہ عاشقم و رند و مے کش و قلاش

کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند — ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند

خواجہ حافظ نے نہایت لطیف طریقہ سے اس مضمون کو ادا کیا ہے لیکن اصل خیال کی بنیاد وہی شیخ کا شعر ہے،

اے قافلہ سالار چنین تند چہ رانی — تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من

آہستہ کہ در کوہ دگر باز پسانند — پیادہ میروم و ہمرہاں سوارانند

ع سجدہ کا بز درا بود، گو سجدہ در بتخانہ باش — ع ہمہ جا جلوۂ یار است چہ مسجد چہ کنشت

اے گنج نوشدارو بر خستگان گذر کن — چہ عذرہا ز بخت خود جویم کہ آں عیار شہر آشوب

مرہم بدست و مارا مجروح مے گزاری — بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہان دارد

سعدی — حافظ

شبے و شمعے و گویندۂ و زیبائے — دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منے

ندارم از ہمہ عالم جز ایں تمنائے — فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

گ

من ایں مقام بدنیا و آخرت ندہم

اے برادر ما بہ گرداب اندریم — اگرچہ در پیم افتند خلق انجمنے

واں کہ شنعت (طعنہ ۱۲) مے زند بر ساحل است

ر

گ

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں ہائل

وے از سنگ بجاید بسر راہ وداع — کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

کہ تحمل کند آں لحظہ کہ تحمل برود

قمی

قمی آں صبر و تحمل کہ باو مے نازی

گر تو خواہی کہ بجوئی دلم، امروز بجوے ـــــ مے نوایم تبو چوں یک دو سہ منزل بجود

ورنہ بسیار بجوئی و نیابی بازم

یہ شعر گویا واسوخت کی بنیاد ہے،

۶۔ شیخ سے پہلے غزل میں جو مضامین ادا کئے جاتے تھے صاف صاف سرسری طور پر ادا کر دیتے تھے، شیخ نے طرز ادا میں بہت سی جدتیں کیں اور بیان کے نئے نئے اسلوب پیدا کئے، وہ ایک معمولی سی بات کو لیتے ہیں اور طرز ادا سے اس میں اعجوبگی پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً اُن کو کہنا یہ تھا کہ گناہ سب کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ اور لوگ پردہ میں کرتے ہیں، اور ہم ریاکاری سے چھپاتے نہیں، اس مضمون کو شیخ اس طرح ادا کرتا ہے

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں ـــــ بازمے پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم

دامن تر گناہ کو کہتے ہیں، بر آفتاب افگندن دھوپ میں ڈالنا، اور کسی کام کے علانیہ کرنے کو بھی کہتے ہیں، دامن تر، اور بر آفتاب افگندن کے محاورہ اور اس طرز ادا نے کس قدر خوبی پیدا کر دی ہے، دہوپ میں ڈال دینے سے چیز خشک ہو جاتی ہے اس لئے یہ بھی کنایہ ہے کہ ریاکاری سے بچنا کسی نہ کسی دن ہم کو گناہ سے مجتنب بھی کر دے گا، یا یہ کہ خدا ایسا گناہ معاف بھی کر دے گا، لیکن ریاکاری کا گناہ نہ چھوٹ سکتا ہے نہ معافی کے قابل ہے

کشتہ بیفندم و قاتل نشناسند کہ کیست ـــــ کیں خدنگ از نظر خلق نہاں مے آید

خواستم تا نظرے افگنم و باز آیم ـــــ گفت ازیں کوچہ ما راہ بدر مے نرود

جمال در نظر و شوق ہمچناں باقی ۔۔۔ گدا اگر ہمہ عالم بدو دہند، گدا است

بعض جگہ معمولی واقعات اور حالات کو اس پیرایہ میں دکھاتے ہیں کہ نہایت عجیب ہو جاتا ہے مثلاً معشوق کی بیوفائی کو جو ایک عام بات ہے، اس طریقہ سے، بیان کرتے ہیں،

فریاد دوستان ہمہ از دست دشمن است ۔۔۔ فریاد سعدی از دل نا مہربان دوست

یعنی اور لوگ تو دشمن کے ہات سے نالاں ہوتے ہیں **سعدی** کی بدقسمتی دیکھو کہ اسکو دوست اور معشوق کے ہات سے فریاد کرنی پڑتی ہے، یا مثلاً یہ شعر،

ہر کس از دست غیر نالہ کند ۔۔۔ سعدی از دست خویشتن فریاد

ہر شخص اپنے کئے کو بھگتتا ہے اور یہ ایک معمولی بات ہے **شیخ** نے اسی بات کو طرز ادا سے ایک اعجوبہ بنا دیا، یعنے اور لوگ تو غیروں سے فریاد کرتے ہیں سعدی خود اپنے آپ سے فریاد کرتا ہے، یا مثلاً یہ شعر،

مبارزاں جہاں، قلب دشمنان شکنند ۔۔۔ ترا چہ شد کہ ہمہ قلب دوستان شکنی

بعض جگہ ایک دعوے کرتے ہیں، جو نہایت مستبعد ہوتا ہے پھر اس کو شاعرانہ توجیہ سے معمولی واقعہ ثابت کر دیتے ہیں،

یادت نمے کنم ہمہ عمر زاں کہ یاد ۔۔۔ آں کس کند کہ دلبرش از یاد میرود

پہلے مصرع میں دعویٰ کیا کہ میں کبھی معشوق کو یاد نہیں کرتا، یہ امر عاشقی کے منصب سے نہایت مستبعد تھا، اس کو اس طرح ثابت کیا کہ یاد وہ کرے جو کبھی بھولتا بھی ہو، میں کبھی بھولتا ہی نہیں تو یاد کیا کروں، بعض جگہ ایک ممکن اور معمولی واقعہ کو شاعرانہ تخیل سے، ناممکن یا مستبعد بنا دیتے ہیں، مثلاً

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من ۔۔۔ ویں عجب کاں دم کہ میگریم کسے بیدار نیست

من از دست تو در عالم نهم ردی — ولیکن چوں تو در عالم نباشد

بہ لطف دلبر من در جہاں نہ بینی — کہ دوستی کند، و دشمنی بیفزاید

گفتہ بودم چو بیائی غم دل باتو بگویم — چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

اسی طرح، جدت ادا کے سینکڑوں اسلوب پیدا کئے، جن کی الگ الگ تشریح نہیں ہو سکتی، اشعار ذیل سے ایک عام اندازہ ہوگا،

دنبال تو بودن گنہ از جانب ما نیست — با غمزہ بگو تا دل مردم نہ رباید

زمن مپرس کہ از دست او دلم چوں است — ازو بپرس کہ انگشتہاش پُر خون است

تو بر کند از گناہ خلق بہ شعبان — در رمضان نیز چشم ہائے تو مست ست

امیر خسرو کی ایک غزل ہے،

اے مسلمانان کس روزہ بدینسان دارد

یہ خیال یہیں سے لیا ہے،

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم — شراب با تو حلال ست و آب بے تو حرام

بہ خشم رفتۂ مارا کہ مے برد پیغام — بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

دے زمانے بر سعدی بتکلف بنشست — فتنہ بنشست و چو برخاست قیامت برخاست

ما نامہ بہ او سپردہ بودیم — او نافہ مشک از فرآورد

اے تماشا گاہ عالم روے تو — تو کجا بہر تماشا میروی

اے مسلمانان بہ فریاد رسید — کاں فلانے بیوفائی مے کند

یار من او باش و قلاش است و رند — لیک بر من پارسائی مے کند

قاضی شہر عاشقاں باید — کہ بیک شاہد اختصار کند

شاہد معشوق کو کہتے ہیں، اور گواہ کو بھی امقدمات کے ثبوت میں عموماً دو گواہ ضرور ہیں، شاعر کہتا ہے کہ گو عام قاعدہ یہی ہے کہ مقدمہ کے ثبوت میں دو گواہ کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن عاشقوں کے ملک میں قاضی کو ایک ہی شاہد (معشوق) پر اکتفا کرنا چاہئے، شاہد کے ذو معنیں ہونے سے جو لطف پیدا کیا ہے وہ مخفی نہیں،

برخیز کہ چشم ہائے مستت خفتہ است و ہزار فتنہ بیدار

اے محتسب از جوان چہ پُرسی من توبہ نمے کنم کہ پیرم

حضرت امیر خسرو دہلوی[1]

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے، امیر خسرو اسی قبیلے سے ہیں، ان کے والد کا نام سیف الدین محمود ہے، ترکستان میں ایک شہر کش ہے، وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے، فرشتہ اور دولت شاہ نے لکھا ہے کہ بلخ کے امرا میں سے تھے، چنگیز خاں کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے، اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہوئے محمد تغلق ان کی نہایت قدر منزلت کرتا تھا، ایک مہم میں کفار سے لڑکر شہید ہوئے،

لیکن صاحب بہارستان سخن، تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں،

پس انچہ دولت شاہ در تذکرہ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسرو در عہد سلطان

---

[1] امیر خسرو کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہے تاریخ فرشتہ میں بھی دلچسپ واقعات ہیں، لیکن خود امیر موصوف نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب سے زیادہ قابل اعتبار ہیں اور جہاں تک اس میں مذکور ہیں میں نے اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے، امیر کی دیگر تصنیفات سے بھی ان کے واقعات معلوم ہوتے ہیں چنانچہ موقع بموقع ان کے حوالے دیئے جائیں گے، ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لندن کی قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں امیر خسرو کی تصنیفات سے ان کے حالات مرتب کئے ہیں، کہیں کہیں اس سے بھی مدد لی گئی ہے،

محمد تغلق شہید شدہ وامیر خسرو را ورحق وے قصائد غرا است خلاف صریح

ومحض غلط است غالباً شاہزادہ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بہ

علت اشتراک اسمی سلطان محمد تغلق خیال کردہ"

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے اعزالدین علی شاہ، حسام الدین، اور امیر خسرو[1]

سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر خسرو کی عمر ۷ برس کی تھی، امیر خسرو کی والدہ عماد الملک

کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے، اور دس ہزار فوج کے افسر تھے، امیر خسرو ۶۰۵ھ

میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے، قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے

تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے، مجذوب نے

دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا، مجذوب

صاحب کے کمالات معنوی کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن ان کے شاعرانہ مذاق کا تسلیم کرنا مشکل

ہے خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت،

جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی

کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر کو پڑھنے لکھنے کے بجائے

---

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو، باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے،

پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں، خسرو دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن پہلی روایت

بظاہر صحیح ہے تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زا ہیں، لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا

ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے، پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا، اب ایٹہ ہے، کسی

زمانہ میں دریا گنگ اسکے نیچے بہتا تھا لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے، یہاں اب اسٹیشن بھی ہے،

شعر گوئی کی دھن رہتی تھی، جو کچھ موزون ناموزون کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیون پر اُسی کی مشق کیا کرتے تھے، خواجہ اصیل کونوال کے نائب تھے وہ کبھی کبھی سعدالدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کے لیئے بلالیا کرتے تھے ایک دن بلایا تو امیر خسرو بھی ساتھ گئے خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزیزالدین بھی تشریف رکھتے تھے سعدالدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ غون غان کرتا ہے معلوم نہیں کہ موزون بھی کہتا ہے یا نہیں ؟ آپ ذرا اس کے کلام کو سُن لیجیے، خواجہ عزیز کے ہات میں اشعار کی بیاض تھی، امیر خسرو کو دی کہ کوئی شعر پڑھو، امیر نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا، چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی لوگوں پر اثر ہوا، سب کی آنکھیں بھر آئیں اور سب نے بے اختیار تحسین کی، ان کے استاد نے کہا شعر گوئی میں امتحان لیجیے، خواجہ عزیزالدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ اُن کو ملا کر شعر کہو، مو، بیضہ، تیر، خربزہ، امیر نے برجستہ کہا،

هر موے که در دو زلف[1] آن صنم است | صد بیضۂ عنبرین بر آں موے ضم است
چوں تیر بداں راس دلش راز بر اکه | چوں خربوزه دندانش درون شکم است

خواجہ عزیزالدین کو سخت حیرت ہوئی، پوچھا نام کیا ہے ؟ اُنھوں نے کہا خسرو، باپ کا نام پوچھا انھوں نے اصل نام کے بجاے قبیلہ کا نام بتایا، یعنی لاچین، خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا، لاچین یعنی "چین نہیں"، پھر کہا "ترک خطا است" یعنے اُن کو ترک کہنا خطا ہے" اُنھوں نے اسی لفظ کو الٹ کر کہا بے خطا ترک است" یعنے قطعاً وہ ترک ہے، خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے اس لیئے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہیئے چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے،

[1] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا،

[2] یہ تمام حالات اپنے امیر خسرو نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں

محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را در حق وے قصائد غرا است خلاف صریح و محض غلط است غالباً شاہزادہ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بہ علت اشتراک اسمی سلطان محمد تغلق خیال کردہ"

بہر حال سیف الدین کے تین بیٹے تھے اعز الدین علی شاہ، حسام الدین، اور امیر خسرو، سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر خسرو کی عمر ۷ برس کی تھی امیر خسرو کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے، اور دس ہزار فوج کے افسر تھے، امیر خسرو ۶۰۵ھ میں بمقام پٹیالی[۲] پیدا ہوئے، قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے، مجذوب نے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا، مجذوب صاحب کے کمالات معنوی کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن ان کے شاعرانہ مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت،

جب اُنہوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر کو پڑھنے لکھنے کے بجائے

---

[۱] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو، باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے، پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں، خسرو دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زاہیں، لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[۲] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے، پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا، اب ایٹہ ہے، کسی زمانہ میں دریا گنگ اسکے نیچے بہتا تھا لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے، یہاں اب اسٹیشن بھی ہے،

شعر گوئی کی دھن رہتی تھی، جو کچھ موزون ناموزون کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیون پر اُسی کی مشق کیا کرتے تھے، خواجہ اصیل کونوال کے نائب تھے وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کے لیئے بلا لیا کرتے تھے ایک دن بلایا تو امیر خسرو بھی ساتھ گئے خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ غون غان کرتا ہے معلوم نہیں کہ موزون بھی کہتا ہے یا نہیں؟ آپ ذرا اس کے کلام کو سُن لیجئے، خواجہ عزیز کے ہات میں اشعار کی بیاض تھی، امیر خسرو کو دی کہ کوئی شعر پڑھو، امیر نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا، چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی لوگوں پر اثر ہوا، سب کی آنکھیں بھر آئیں اور سب نے بے اختیار تحسین کی، ان کے استاد نے کہا شعر گوئی میں امتحان لیجئے، خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ اُن کو ملا کر شعر کہو، مو، بیضہ، تیر، خربزہ، امیر نے برجستہ کہا،

هر موے که در دو زلف آں صنم است ۔۔۔ صد بیضه عنبرین برآں موے ضم است [1]

چوں تیر بداں راس ولش را زیرا که ۔۔۔ چوں خربوزه دندانش درون شکم است

خواجہ عزیز الدین کو سخت حیرت ہوئی، پوچھا نام کیا ہے؟ اُنھوں نے کہا خسرو، باپ کا نام پوچھا انھوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا، یعنی لاچین، خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا، لاچین یعنی "چین نہیں"، پھر کہا "ترک خطا است" یعنے اُن کو ترک کہنا خطا ہے" اُنھوں نے اسی لفظ کو الٹ کر کہا بے خطا ترک است" یعنے قطعاً وہ ترک ہے، خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے اس لئے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہیئے چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے،

[1] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا،

[2] یہ تمام حالات اپنے امیر خسرو نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں

امیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے اسکے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی، تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵-۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم وفنون سے فارغ ہو چکے تھے،

درباری تعلقات امیر خسرو جب سن رشد کو پہنچے تو دلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا، اس کے امراے دربار میں سے کشلو خاں معروف بہ چھجو[ل] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا، وہ سلطان کا بھتیجا اور باربکی کے عہدے پر مامور تھا، فرشتہ میں لکھا ہے کہ "مجلس آرائی اور جود وکرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا اور مصر، شام، روم، بغداد، عراق، خراسان، ترکستان، وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اس کے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے، بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا، یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیراہن کے سوا کچھ نہ رہا،

امیر خسرو کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے سب سے پہلے اس کے دربا

[ل] چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اسطرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں، امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلو خان عرف چھجو کے دربار میں پہنچا، اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں، بدایونی (صفحہ ۱۵۸ جلد اول) میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا، اور سلطان معز الدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی،

فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد بن اعز الدین، سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا، سلطان نے اس کو باربک مقرر کر کے خان اعظم کو کشلی خاں خطاب دیا، بدایونی (صفحہ ۱۶۴) میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر لکھا ہے کہ اس کو کشلو خاں خطاب ملا تھا، ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین کشلو خاں، چھجو ایک ہی شخص ہیں،

میں رسائی حاصل ہوئی، اور دو برس تک اس کے دربار میں ملازم رہے، چنانچہ اکثر قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں، ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں،

بود پنہان آفتاب آں دم کہ صبح ہمارے باباد عنبر بو نمود

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است آسمان روے ملک چھجو نمود

امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے،

زشاہان کسے کا و علم کرد یاد معز الدنا بود شہ کیقباد

لیکن اس سے کتلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا، کتلو خاں امرا میں سے تھا، بادشاہ نہ تھا بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر کی قدر دانی کی وہ معز الدین کیقباد تھا، امیر خسرو اکثر کتلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لیجاتے اور مجلس گرم کرتے تھے،

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) بھی موجود تھا اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے، شمس الدین دبیر، اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے، امیر خسرو نے اپنی زمزمہ سنجی سے یہ سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا، اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپے دیئے کتلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا وابستہ دولت دوسرے دربار کا احسان اُٹھائے، چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوئے امیر خسرو نے اس کے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اس کی تلافی کرنی چاہی لیکن کتلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی،

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا، امیر خسرو نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا بغرا خاں نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم خاص بنایا، اسی زمانہ نے یعنی ۶۷۶ھ میں لکھنوتی

[1] یہ تمام حالات خود امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں،

(بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں، بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ لیا[ل] امیر خسرو بھی اس سفر میں ساتھ گئے[ل]، سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دلی واپس آیا اور بنگالہ کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی امیر خسرو کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ان کے قیام پر مصر تھے، لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ رخصت لے کر دلی میں آئے اتفاق سے اسی زمانے میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلّی میں آیا تھا، وہ نہایت قابل، صاحب علم، فیاض اور قدردان علم و فن تھا، تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گزر جاتا تھا، لیکن زانو نہیں بدلتا تھا، اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی انوری، خمسۂ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے، ایک بیاض تیار کی تھی جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کر کے درج کئے تھے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے،

یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی، امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہات آئی ارباب ذوق

ل تاریخ فرشتہ

ل امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے لیکن اس قدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے ایک اور دقت سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ سخت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے،

اس کی نقلیں لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کرتے تھے[1]،

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا، سلطان محمد نے ان کو بلا کر شعرائے خاص میں داخل کیا، اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو کر گیا تو ان کو اور ان کے ساتھ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا، پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے، اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغون خان ایران کا حکمران تھا، اس کے امرا میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لے کر لاہور اور دیپال پور کو فتح اور غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا، سلطان محمد قاآن نے ملتان سے نکل کر تیمور خاں کو شکست دی، لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی ایک تالاب کے کنارے پانچسو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا، یہ موقع پا کر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا سلطان محمد نے انہی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور گو بار بار انکو شکستیں دیں لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا اور زخم کھا کر مر گیا[2]،

امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے چنانچہ تاتاری ان کو گرفتار کر کے بلخ لے گئے، یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا[3]، امیر خسرو نے نہایت پُر اثر مرثیے لکھے اور دلی بھیجے، مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے، چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں،

واقعہ است ایں یا بلا از آسمان آمد پدید	آفت است ایں یا قیامت در جہان آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را	رخنۂ کامسال در ہندوستان آمد پدید
مجلس یاراں پریشان شد چو برگ گل ز باد	برگ ریزی گوئی اندر بوستان آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چارسو	پنج آبے دیگر اندر ملتان آمد پدید

[1] تاریخ فرشتہ [2] تاریخ فرشتہ، [3] بدایونی صفحہ ۱۳۱،

جمع شد سیارہ در چشمم مگر طوفان شود | چوں بہ برج آبی انجم را قران آمد پدید

من نخواہم جز ہماں جمعیت وایں کے شود

خود محال ست ایں نبات النعش پروین کے شود

تا چہ ساعت بد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید | تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید

انچہ حاضر بود لشکر لشکر دیگر نہ جست | زانکہ رستم را نشاید منت لشکر کشید

چوں خبر کردندش از دشمن بداں قوت کہ داشت | بے محابا خشم در سر کرد و رایت بر کشید

یک کشش از مولتانش تا بہ لاہور اوفتاد | یعنی انار رعہا من کافر تو اندر کشید

آنچناں رنگین کنم امسال خاک از خون شاں | کز زمین بایذ شفق را گوشۂ احمر کشید

او دریں تدبیر و آگہ نے کہ تا تدبیر فلک | صفحۂ تدبیر را خط مشیت در کشید

تا چہ ساعت بد کہ کافر بر سر لشکر کشید

جوق جوق از آب بگذشتند و ناگہ در رسید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے، اخیر کے بند جہان شہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پر اثر ہیں،

دو برس کے بعد امیر نے کسی طرح تاتاریوں کے ہات سے رہائی پائی، اور دلی میں آئے خان شہید کے مرنے پر جو مرثیہ لکھا تھا، غیاث الدین بلبن کے دربار میں جا کر پڑھا دربار میں کہرام پڑ گیا، کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، سلطان اس قدر رویا کہ بخار آ گیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر گیا،

امیر دلی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے، ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اس کے خلاف وصیت، اس کے

پوتے کیقباد کو جو بغرا خاں کا بیٹا تھا، تخت نشین کیا،

کیقباد نے امیر خسرو کو دربار میں طلب کیا لیکن چونکہ عنان سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی، اور وہ امیر سے صاف نہ تھا امیر نے تعلق پسند نہ کیا اور خان جہان جو امرائے شاہی میں تھا اُس کی ملازمت اختیار کی،

خان جہان اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر کو ساتھ لے گیا، چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں،

خان جہان حاتم مفلس نواز	گشت بہ اقطاع اودھ سرفراز
من کہ بُدم چاکر او پیش ازاں	کرد کرم انچہ کہ بد بیش ازاں
تا ز چنان بخشش خاطر فریب	بندہ شدہ لازمۂ آں رکیب
در اودھم بردز لطف چنان	کیست کہ از لطف بتابد عنان
در اودہ از بخشش او تا دو سال	ہیچ غم و نالہ نبود از مثال

دو برس تک اودھ میں رہے، ان کی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی، وہ دلی میں تھیں، اور اُن کے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی امیر کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی، چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے، ماں نے گلے سے لگا لیا اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے،

مادرم آں خستۂ تیمار من	چوں نظر افگند بہ دیدار من
پردہ ز روئے شفقت بر گرفت	اشک فشانان بہ برم در گرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی، اس کا باپ بغرا خاں بنگال میں تھا، یہ حالت سنکر بنگال سے روانہ ہوا، کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا

چاہا چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کرکے دلی سے روانہ ہوا، راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے آخر صلح پر خاتمہ ہوا اور کیقباد دلی کو واپس آگیا،

امیر خسرو نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

زہے ملک خوش چوں دو سلطان یکے شد ۔۔۔ زہے عہد خوش چوں دو پیمان یکے شد

پسر بادشاہے، پدر نیز سلطان ۔۔۔ کنوں ملک ہیں چوں دو سلطان یکے شد

زمہر جہانداری و بادشاہی ۔۔۔ جہاں را دو شاہ جہانبان یکے شد

یکے ناصر عہد محمود سلطان ۔۔۔ کہ فرمانش در چار ارکان یکے شد

دگر شہ معز جہان کیقبادے ۔۔۔ کہ در ضبطش ایران و توران یکے شد

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات، نظم کے پیرایہ میں آئیں امیر خسرو کو بلا کر یہ خواہش ظاہر کی چنانچہ امیر نے چھ مہینے کی مدت میں قرآن السعدین لکھی، جس میں باپ بیٹے کے مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اس وقت امیر کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۸ تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ساختہ گشت از روش خامہ ۔۔۔ از پس شش ماہ چنین نامہ

در رمضان شد بہ سعادت تمام ۔۔۔ یافت قرآن نامہ سعدین نام

انچہ بتاریخ ز ہجرت گزشت ۔۔۔ بود سن ششصد و ہشتاد و ہشت ۶۸۸

سال من امروز اگر بررسے ۔۔۔ راست بگویم ہمہ شش بود وسی ۳۶

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹[1] ھ میں مرگیا یا مارا گیا، اسکے

---

[1] بدایونی،

بعد اس کا خرد سال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا، وہ بالکل بچہ تھا، تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اُتار کر قید کر دیا، اب اس خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا اس لئے ترکی امرائے دربار میں سے **ملک فیروز شائستہ خاں خلجی** جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا، تخت سلطنت پر بیٹھا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا، وہ بڑے عظمت اور اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا اس کے ساتھ نہایت صاحب مذاق، رنگین طبع، خوش صحبت، تھا شعر بھی کہتا تھا، چنانچہ بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں،

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمے خواہم — دان روئے چو گلنارت تفسیدہ نمے خواہم

بے پیر منت خواہم یک شب بکنار آئی — ہاں بانگ بلندست ایں پوشیدہ نمے خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے، سب قابل، اہل فن، موزون طبع اور رنگین مزاج تھے، مثلاً ملک تاج الدین کرجی، ملک فخر الدین، ملک اعز الدین، ملک قرابیگ، ملک نصرت ملک حبیب، ملک کمال الدین، ابوالمعالی، ملک نصیر الدین کہرامی، ملک سعد الدین، انیس اور ہم صحبت تھے،

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کیے تھے، چنانچہ تاج الدین عراقی خواجہ حسن دہلوی، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر ارسلان، اختیار الدین باقی، ندمائے خاص میں تھے، ساقی، مغنی اور مطرب بھی وہ لوگ تھے جو زمانہ میں انتخاب تھے، مثلاً امیر خاصہ حمید راجہ، نظام، محمد شاہ، نصیر خاں، بہروز[1]

ایسے گوناگون صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لئے امیر خسرو سے زیادہ کون

---

[1] فرشتہ،

موزوں ہو سکتا تھا، وہ عالم بھی تھے، فاضل بھی، مغنی بھی، مطرب بھی، اور شاعر تو تھے ہی،

معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا، اسی وقت اس نے امیر خسرو کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا تھا، چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کر کے خاص اپنا لباس عنایت کیا تھا تخت پر بیٹھا تو امیر کو ندیم خاص بنایا اور مصحف[1] داری اور امارت کا عہدہ دیا، اس کے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امراء کبار کا مخصوص لباس تھا ان کے لئے مقرر کیا، امیر خسرو جو "امیر" کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے،

امیر نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کئے اور تاج الفتوح نام رکھا، اس کی تفصیلی کیفیت آگے آئے گی، جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۵ھ میں دھوکے سے قتل کرا دیا، اور خود تخت نشین ہوا، سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بیرحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اس کی طینت کا جوہر تھا، تاہم بہت بڑے عزم و استقلال اور شوکت و شان کا فرمان روا گزرا ہے، عجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت خیز نہیں اس کا دربار فقرا، علما، فضلا، شعرا سے ہر وقت معمور رہتا تھا، ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں[2]،

قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی فخر الدین کرمانی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین مقدم، قاضی ضیاء الدین، مولانا ظہیر الدین لنگ، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی زین الدین ناقلہ، مولانا شرکتی، مولانا نصیر الدین رازی، مولانا علاء الدین صدر شریف، مولانا میران بابک کلہ، مولانا نجیب الدین بیانوی، مولانا شمس الدین، مولانا صدر الدین، مولانا علاء الدین لاہوری،

[1] جس کو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اس کو مصحف دار کہتے تھے۔

[2] یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہے،

قاضی شمس الدین کازرونی، مولانا شمس الدین بخشی، مولانا شمس الدین، مولانا صدرالدین پادہ،

مولانا معین الدین لولوی، مولانا افتخارالدین رازی، مولانا معزالدین اندرپتی، مولانا نجم الدین،

مولانا حمیدالدین بلوری، مولانا علاءالدین کرک، مولانا حسام الدین سادہ، محی الدین کاشانی،

مولانا کمال الدین کولوی، مولانا وجیہ الدین کابلی، مولانا منہاج الدین، مولانا نظام الدین کلاتی،

مولانا نصیرالدین کری، مولانا نصیرالدین بوبی، مولانا علاءالدین تاجر، مولانا کریم الدین جوہری،

مولانا محسب ملتانی، مولانا حمیدالدین، مولانا برہان الدین بھکری، مولانا افتخارالدین، مولانا

حمیدالدین ملتانی، مولانا گل محمد شیرازی، مولانا حسام الدین سرخہ، مولانا شہاب الدین ملتانی،

مولانا فخرالدین نسوی، مولانا فخرالدین شقاقلی، مولانا علیم الدین،

قرار مولانا نشاطی، مولانا علاءالدین سغری، خواجہ زکی،

واعظین، مولانا حسام الدین درویش، مولانا شہاب الدین، مولانا کریم،

شعراء خواجہ حسن دہلوی، صدرالدین عالی، فخرالدین قواس، حمیدالدین راجہ، مولانا عارف عبدالحکیم، شہاب الدین، لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کردیا تھا،

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے، انکے بعد اگر کسی کے خط وخال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں کہ وہ بھی امیر ہی کا فیض ہے، علاءالدین نے امیر خسرو کا ایک ہزار سالانہ ٹنکہ[1] مقرر کیا تھا، امیر نے سلطان علاءالدین کی تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا، جس کا نام خزائن الفتوح ہے، تفصیل اس کی آگے آئے گی،

۶۹۸ھ میں امیر کی والدہ اور اُن کے بھائی حسام الدین نے انتقال کیا، چنانچہ لیلی مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُردرد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے،

[1] تاریخ فرشتہ، غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا،

نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا، چنانچہ ہر کتاب سلطان علاء الدین کے نام سے معنون ہے، سب سے آخری مثنوی ہشت بہشت ہے جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی،

اسی زمانہ میں امیر نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ہات پر بیعت کی، چنانچہ تفصیل آگے آئے گی، سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس کی حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات کی، اس کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین (مدت حکومت ۳ ماہ) اور اس کے بعد ۷۱۷ھ میں قطب الدین، مبارک بن علاء الدین خلجی، بادشاہ ہوا، وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز، اور سبک سر تھا، لیکن امیر کی قدردانی سب سے بڑھ کر کی، چنانچہ امیر نے جب ۷۱۸ھ میں اس کے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپے دیئے، چنانچہ خود امیر قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں،

بتاریخ ہمچوں من اسکندرے	کند ہر کہ آرائش دفترے
ز گنج گراں مایۂ بے شمار	دہم بازتیش نہ آں پیلبار
مرا خود دریں رہ پدر شہ دلیل	کہ میداد زر، ہم ترازوے پیل
شناسد کسے کش خرد رہنموں	کہ از پیلبار است وزنش فزوں
چو میراث شد پیل زر دادنم	نہ زیبا است زیں سہل تر دادنم
شہا! گنج بخشا! کرم گسترا!	معانی شناسا سخن داورا!
چنیں بخششے کز تو جسم یافتم	در ایام پیشینہ کم یافتم
کنوں لا اندازِ سحرِ سنج چو من	بر اندازۂ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نو مسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دیکر قلمدان وزارت عطا کیا تھا، اُس نے ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کر کے، خود تخت حکومت پر جلوس کیا، چونکہ

اُس نے دربار میں تمام ہندو بھر دیئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کئے، امرا نے بغاوت کی، چنانچہ ۹ مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۱ھ میں غازی ملک کے ہات سے قتل ہوا،

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے جسکا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندنی تھی، دربار میں پکار کر کہا کہ مجھ کو تخت سلطنت کی آرزو نہیں، خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے، لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا، اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا، اس لئے سب نے بہ اتفاق اسی کو بادشاہ بنایا، وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا، اس نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی، اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے امیر خسرو کی اُس نے نہایت قدردانی کی، اور اُن کو دولت اور مال سے نہال کر دیا، امیر نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا چنانچہ اُس کے نام پر تغلق نامہ لکھا، جو تغلق کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ہے،

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر خسرو ساتھ گئے، تغلق واپس آیا لیکن امیر خسرو وہیں رہ گئے، اسی اثنا میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے انتقال کیا امیر یلغار کرتے ہوئے دلّی میں آئے اور جو کچھ زر و مال پاس تھا خواجہ صاحب کے نام پر نثار کر دیا، ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے، چھ مہینے کے بعد ذی قعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا، خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا، لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنا چاہی، لیکن ایک خواجہ سرا نے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا، غرض خواجہ صاحب کے پائنتی دفن کیا، اور اس سے بڑھ کر اُن کی کیا خوش قسمتی ہوسکتی تھی[1]،

وفات

[1] خزانہ عامرہ،

ان کا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امرا میں سے تھا تعمیر کرایا اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ کہہ کر لوح پر کندہ کرائی،

شد "عدیم المثل" یک تاریخ او
واں دگر شد "طوطی شکر مقال"

امیر کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی[1]، ان کے ایک صاحبزادہ کا نام ملک احمد ہے، وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے، ان کی شاعری نے چنداں فروغ حاصل نہیں کیا، لیکن شعر اور شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے، اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے، اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اس کو تسلیم کرتے ہیں، ظہیر کا شعر ہے،

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ
ربودہ از سر گردون کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا جس سے مصرع کی ترکیب بہت چست ہو گئی، بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے،

ایں سہل بود کہ گوگردِ سرخ خواست
گر نان خواجہ خواستی آں را چہ کردمے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی،

ایں سہل بود کہ آب حیات خواست
گر نان خواجہ خواستی آں را چہ کردمے

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کر دیا،

ایک اور شعر تھا،

خان دان اور آل و اولاد،

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرنج
نرخ گہر بہ طعن خریدار نشکند

[1] فرشتہ حالات خسرو،

ملک موصوف نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا،

اگر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج،

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر خسرو کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے،

بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ "ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے اسلئے

بادشاہ اور درباری اس کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے،

امیر خسرو کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی

ایسی بیقدری تھی کہ امیر کو اُن کے پیدا ہونے کا رنج تھا، جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر

نے لیلی مجنوں لکھی، اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں،

اے زعفت فگندہ برقع نور	ہم عفیفہ بنام وہم مستور
کاش ماہ تو ہم بہ بچہ بودے	در رحم طفل ہشت مہ بودے
لیک چوں دادہ خدائی رواست	باخدا دادگان ستیزہ خطا ست
من پدر بر فستم انچہ یزدان داد	کانچہ او داد باز نتوان داد
پدرم ہم زمادر است آخر	مادرم نیز دختر است آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم نہ پیدا ہوتیں، یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں، پھر طرح

طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دیئے کو کون ٹال سکتا ہے اور آخر میرا

باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا، اور میری ماں بھی تو آخر عورت ہی تھی،

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کی حالت

نہایت پست تھی، امیر خسرو اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے لیکن بیٹی سے کہتے ہیں

کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر نہ جھانکنا،

دوک وسوزن گزاشتن نہ فن است | کالت پردہ پوشی بدن است
پا بہ دامان عافیت سر کن | رو بہ دیوار و پشت بر در کن
در تماشای روزنت ہوس است | روزنت چشم سوزن تو بس است

امیر کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی، بڑی عمر کو بھی پہنچکر وہ اس جوش محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں، اودھ کی معقول ملازمت صرف اس بنا پر چھوڑ دی کہ ماں دلی میں تھیں اور اُن کو یاد کیا کرتی تھیں اودھ سے جب دلی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے۔

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگا لیا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے، چنانچہ دو نہریں دودھ کی اُس میں جاری ہیں، ۶۹۰ھ میں انہوں نے انتقال کیا، اسی سال اُن کے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا، لیلیٰ مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے،

امسال دو نور ز اخترم رفت | ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من | گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم | چرخ از دو طپانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غمم دو افتاد | فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ چوں منے را | یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ دو بار بر نگیرد | یک سر دو خمار بر نگیرد

چوں مادر من بزیر خاک است | گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر | روے از چہ نمے نمائی آخر
خنداں زدل زمین بروں آے | بر گریہ زار من بہ بخشاے
ہر جا کہ زپاے تو غباری است | مارا ز بہشت یادگاری است
ذات تو کہ حفظ جان من بود | پشت من و پشت بان من بود
روزے کہ لب تو در سخن بود | پند تو صلاح کار من بود
امروز منم بہ مہر پیوند | خاموشی تو ہمے دہد پند

اڑتالیس برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کمسن بچہ ماں کے لئے بلکتا ہے، اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خون جگر سے رنگین ہیں،
امیر خسرو اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو عام دنیاداروں کا طریقہ ہے لیکن یہ امران کی اصل فطرت کے خلاف تھا، درباداری، خوشامد اور شخص پرستی سے اُن کو طبعی نفرت تھی اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار ان کی زبان نکل جاتے تھے، لیلیٰ مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی جب ان کو سلطان علاء الدین خلجی جیسے جبّار بادشاہ سے تعلق تھا، تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں،

شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نگیرم آرام
با شسم ز براے نفس خود رائے | پیش چو خودی، ستادہ بر پاے

اس پر مزید یہ ہوا کہ اُن کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لئے بیعت کرا دی تھی، خواجہ صاحب کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی، امیر خسرو کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی

تھا وہ سرتاپا عشق تھے اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں گوندتی پھرتی تھی آخر یہ نوبت پہنچی کہ ۷۱۳ھ میں جیسا کہ خود افضل الفواید میں لکھا ہے خواجہ صاحب کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی اور مریدان خاص میں داخل کیا، قدرت اللہ قدرت نے طبقات الشعرا میں لکھا ہے کہ امیر نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا، سب لٹا دیا اور پابدامن ہو کے بیٹھ گئے،

خواجہ صاحب سے امیر کی ارادت اور عقیدت، عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے، خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے "کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کردوں گا،، دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے، الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش،

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر، ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے، امیر خسرو بھی حاضر تھے خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو،

ع ہر قوم راست راہے دینی و قبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر نے اُس کی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا، ع

ما قبلہ راست کردیم برطرف کجکلاہے

جہانگیر نے، تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے، میں نے اس کا شان نزول پوچھا، مُلا علی احمد مُہرکن نے واقعہ بیان کیا، مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے مُلا کی حالت بدلنی شروع ہوئی یہاں تک کہ غش کھا کر گرے

دیکھا تو دم نہ تھا۔[1]

خواجہ صاحب نے امیر خسرو کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا اور اسی لقب سے پکارتے تھے امیر نے جابجا اس پر فخر کیا ہے، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں،

برزبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت　　دست ترک اللہ گیر وہم بہ اللہش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا،

امیر نے تصوف میں جو مدارج حاصل کئے، اُن کو ہم نہ جان سکتے اور نہ بیان کرسکتے ہیں، یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے وہ اسی وادی ایمن کی شرر باریاں ہیں،

امیر کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے، امیر کا عین شباب تھا کہ ایکدن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گزرے، آفتاب حسن کی شعاعیں اُن پر بھی پڑیں وہیں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو حسن نے کہا کہ ایک پلڑے میں روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے پلہ میں سونا رکھے، سونے کا پلہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں، امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد اور نیاز لیتا ہوں، اس اندازِ گفتگو نے امیر کو اور بھی بے اختیار کر دیا،

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۸۱ مطبوعہ علی گڑھ،

ن، نظام الدین اولیا کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، حسن نے گوناگوں اندازی کی تھی، لیکن خود بھی شکار ہو گئے، اسی وقت دکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور اپنے دلدادہ (امیر خسرو) سے ملے، اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے[1]،

امیر سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لیے بھی جدا نہیں ہوتے تھے امیر نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو خسرو کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی امیر نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی،

زیں دل خود کام کار من برسوائی کشید　　　خسروا فرمان دل بردن ہمیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر کے ملنے سے منع کر دیا، لیکن کچھ اثر نہ ہوا، خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہات پر کوڑے لگوائے، حسن سیدھے خسرو کے پاس گئے، خان شہید کو اسی وقت پرچہ لگا، نہایت متحیر ہوا اور امیر کو بلوا بھیجا، آئے تو کہا کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہات نکال کر دکھایا اور کہا، ع

گواہ عاشق صادق در آستین باشد،

---

[1] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے لیکن صاحب بہارستان سخن نے اس کی معقول بنا پر تکذیب کی ہے اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے "و بہ قیاس چناں درمے آید کہ حسن را بہ نسبت امیر خسرو گونہ تقدم باشد، چہ امیر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن، قصائد غرااست و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے میتوان یافت"

دیکھا تو جہان حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں خسرو کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے،[1]

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے، اور صنف غزل پر ان کا خاص احسان ہے، اس لئے ان کے شیدائی، امیر خسرو ہی کے تذکرہ میں اُن کے اشعار نقل کرتے ہیں،

خلق گویند، دل از صبر، بجا آور باز ایدل از صبر نشانے دہ اگر جاے ہست

ایکہ نظارۂ دیوانہ نہ کردی ہرگز قدمے رنجہ کن، ایں سوے کہ رسواے ہست

برچوں تو، کسے دگر گزیدن کارے دگرست، کار من نیست

گفتی کہ چرا جدائی از من ایں از فلک ست از حسن نیست

باز ایں دلم بسوے دلارام مے رود از دام جستہ، باز سوے دام مے رود

ایام در نیامدہ با ما بہ دوستی واں شوخ ہم بسیرت ایام مے رود

اے خواجہ! در محلہ تقوے قیام گیر در کوے عاشقی نتواں نیک نام شد

عقلم کہ زیں بر ابلق ایام مے نہاد آخر بتازیانۂ عشق تو رام شد

طرفہ سرو کارے است کہ با وعدۂ معشوق صابر نتوان بود و تقاضا نتوان کرد

از حسن ایں چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست ایں سخن را چہ جواب ست، تو ہم مے دانی

دو سہ بار، با تو گفتم کہ مرا بہ ہیچ بستان نہ شد اتفاق، شاید کہ بر ایں بہا گرانم

تلخ کردم جہانیان را خواب زاں دعا ہا کہ مستجاب نبود

اے حسن بار گر خطاے کرد ہم شکایت از و، صواب نبود

بہ تقوے نام نیکو بردہ بودم نکورویان، مرا بدنام کردند

---

[1] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں لیکن اخیر کا واقعہ آج کل کون تسلیم کرے گا،

گفتی کہ چرا حال دل خویش، نہ گوئی — من خود کنم آغاز بہ پایان کہ رساند

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز، اور جذبہ و اثر، ان کے کلام میں موجود ہے ان کے کشتۂ محبت (امیر خسرو) میں بھی نہیں،

جامعیت اور کمالات

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگون اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے، صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری، بے شبہہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں لیکن ان کی حدود حکومت، ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے، فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہات نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ، عرفی، نظیری، غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنے تضمین، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں،

انواع شاعری

تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعوے نہیں ہو سکتا، فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے، لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے، لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے، امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے، اور قدماء کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جابجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتین ہیں،

اشعار کی تعداد

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرہ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام ونشان بھی نہیں،

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے، عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں،

سنسکرت دانی

سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے

ع من قدرے بر سراں کار شدم،

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے، اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اُصول اور قاعدے نہیں مرتب کیے تھے، اُنھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور، صنائع وبدائع پر بیکار گیا، لیکن اُن کی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کرسکتا ہے،

موسیقی

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب، ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کرسکا، چنانچہ اس کی تفصیل مستقل عنوان میں آتی ہے،

فقر وتصوف

ان مختلف الحیثیات، مشغلوں کے ساتھ فقر وتصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا، عالم قدس کے سواد دنیائے فانی کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا، چنانچہ اس کا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا،

عدیم الفرصتی

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ اُن کو ان کاموں میں مشغول ہونے کے لیے وقت کس قدر ملتا تھا، تو سخت حیرت ہوتی ہے، وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی، کام جو سپرد تھا، وہ شاعری نہ تھی بلکہ اور اشغال تھے، لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،

مسکین من مستمند مدہوش، | از سوختگی چو دیگ پُر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نہ گیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود رای | پیش چو خودی ستادہ بر پای

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے، صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں،

تا خون نہ رود ز پاے تا سر | دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا، کھانا کھانے کو نہیں ملتا،

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت اُن کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا،

موسیقی | امیر کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا، ان کے زمانہ کا مشہور جگت اُستاد جو تمام ہندوستان کا اُستاد تھا، نایک گوپال تھا اس کے بارہ سو شاگرد تھے، جو اس کے سنگھاسن یعنے تخت کو کہاروں کی طرح کاندھے پر لے کر چلتے تھے، سلطان علاء الدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا امیر خسرو نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں، نایک گوپال سے گانے کی فرمایش کی جائے، نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا، ساتویں دفعہ امیر بھی اپنے شاگردوں کو لے کر دربار میں آئے گوپال بھی اُن کا شہرہ سُن چکا تھا، اُن سے گانے کی فرمایش کی، امیر نے کہا میں مغل ہوں، ہندوستانی گانا کچھ یوں ہی سا جانتا ہوں، پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا،

گوپال نے گانا شروع کیا، امیر نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں پھر خود اُس کو ادا کیا، گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا، امیر نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں

پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں، غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا تھا امیر اس کو اپنا ایجاد ثابت کرتے جاتے تھے، بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے، اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں، پھر جو گایا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا[1]،

امیر خسرو چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے، اس لیئے انہوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دے کر ایک نیا عالم پیدا کر دیا، چنانچہ اُن کے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[2]،

نام راگہائے مخترع امیر خسرو	کن راگوں سے مرکب ہے
مجیر،	غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے
ساز گری	پوربی، گورا، کنگلی، اور ایک فارسی راگ
	قران السعدین میں اس کا ذکر کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں

زمزمۂ ساز گری در عراق　　　　کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق

---

[1] عالمگیری علماء میں فقیر اللہ جس کا لقب سیف خاں تھا ایک مشہور امیر تھا، ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے،

گفتگوئے طوطی از آئینہ مے خیزد علی　　　　گر نباشد سیف خاں مارا نفس درکار نیست

وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا، فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل تھی، فقیر اللہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور اور بہت سے فوائد اضافہ کئے اور اس کا نام راگ درپن رکھا، چنانچہ مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۴۷۹ مطبوعہ کلکتہ میں یہ تفصیل مذکور ہے اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے گوپال کا واقعہ اور آئندہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی کتاب سے لئے ہیں،

[2] راگ درپن کے دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں، دونوں غلط ہیں اس لئے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے اس لئے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے،

ایمن	ہنڈول اور نیریز
عشاق	سارنگ اور بسنت اور نوا
موافق	توڑی و مالڑی و دوگاہ و حسینی
غنم	پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے،
زیلف	کھٹ راگ میں شہ ناز کو ملایا ہے
فرغنہ	کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے
سرپردہ	سارنگ، بلاول، اور رہست کو ترکیب دیا ہے،
باخرز	دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا،
فردوست (یا)، پھردوست	کانہڑا، گوری، پوربی، اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
منم	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں ساز گری، باخرز، عشاق اور موافق میں، موسیقی کا کمال دکھایا ہے، باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کرکے دوسرا نام رکھ دیا ہے **قول ترانہ خیال، نقش،** نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ، یہ سب بھی امیر خسرو کی ایجاد ہیں، ان میں سے بعض خاص اُن کی ایجاد ہیں، بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے امیر نے ان میں کچھ تصرف کرکے نام بدل دیا،

تصانیف **جامی** نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر خسرو نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں یہ بھی مشہور ہے کہ امیر نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں، اوحدی نے عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے

اس سے زیادہ ہندی میں ہے،

امیر کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں، چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے، اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے، اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴، ۵ لاکھ سطریں ہوں، تو چنداں تعجب نہیں، لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھ دیا، ہندی کلام مدون نہیں ہوا، اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے، بہرحال جسقدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

دیوان[1] تحفۃ الصغر	اسکے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے،
دیوان وسط الحیات	اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۳ یا ۳۴ برس کا کلام ہے، اس میں جو قصائد ہیں، سلطان شہید کشلو خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں،
غرۃ الکمال	یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا، ۳۴ برس کی عمر یعنی ۶۸۵ھ سے تقریباً

[1] امیر نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اسوقت میرے پیش نظر ہے، اور دیوانوں کے دیباچے بھی نظر سے گذرے ہیں، لیکن اسوقت سامنے نہیں اسلئے اُن کی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو (آر آئی ای وی) کے اس ریویو سے ماخوذ ہے جو اُنھوں نے برٹش موزیم کے کتب خانہ کی فہرست میں لکھی ہیں، اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبد القادر پروفیسر پونا کالج کا ممنون ہوں،

۶۹۵ھ تک کا کلام ہے، دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے، سلطان معز الدین کیقباد، اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں، دو ہفتہ میں اس اس کی ترتیب کی اور دیباچہ لکھا،

بقیہ نقیہ
بڑھاپے کا کلام ہے، تاریخ تالیف مذکور نہیں، لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اس لئے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے،

نہایۃ الکمال
پانچواں دیوان ہے، اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اسکے ولی عہد کی مدحیں ہیں، ایک قصیدہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن میں خسرو نے انتقال کیا ہے،

قران السعدین
سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جبکہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی، کیقباد، اور بغراخاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے،

مطلع الانوار
مخزن الاسرار کا جواب ہے، سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی ۳۳۱۰ شعر ہیں، دو ہفتہ میں تمام ہوئی سال اختتام ۶۹۸ھ ہے، تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے،

شیریں خسرو — رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی ۴۱۲۴ شعر ہیں،

آئینہ اسکندری — سکندر نامہ کا جواب ہے سال اختتام ۶۹۹ھ ہے اشعار کی تعداد ۴۴۵۰

لیلیٰ مجنوں — ۲۶۶۰ شعر ہیں، ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی،

ہشت بہشت — سلسلہ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے، ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں،

پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں، خمسہ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں یہ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں،

تاج الفتوح — سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اوّل یعنے ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں، اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی مطلع یہ ہے، سخن بر نام شاہے کردم آغاز،

نہ سپہر — قطب الدین خلجی کے نام پر ہے، نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے، اس مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا ہے، اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی،

دولرانی خضر خاں — دول رانی گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی، خضر خاں

سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا، وہ دول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی، خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے، اس کی فرمایش سے امیر خسرو نے اس کو نظم کا لباس پہنایا، اور عشقیہ نام رکھا، چار مہینے میں تمام ہوئی۔ ۴۲۰۰ شعر تھے، خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے، اُن کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا، ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی،

افضل الفوائد — خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں،

اعجاز خسروی — نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کیے ہیں، اور سینکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں، ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی تین جلدوں میں ہے،

تغلق نامہ — غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں،

خزائن الفتوح — سلطان علاء الدین کی فتوحات ہیں،

مناقب ہند، تاریخ دہلی — ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے،

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں،

شاعری، امیر خسرو اگرچہ ہندی نژاد تھے، لیکن ایرانی شعرا کو بھی اُن کی شاعری اور زباندانی کا اعتراف کرنا پڑا، جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی

نے نہیں لکھا، طوطیٔ ہند جو اُن کا خطاب تھا، ایرانی بھی اسی خطاب سے ان کو یاد کرتے ہیں،

عرفی، بروح خسرو ازیں پارسی شکر دادم — کہ کام طوطیٔ ہندوستان شود شیریں

خواجہ حافظ شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کیلئے شیراز سے دلی میں آئے، اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں، اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحتہً اس واقعہ سے انکار کیا ہے، تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا اور اس قدر تو تمام مورخوں اور تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انہوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں، ان کی تربیت کی جائے، اس وقت خسرو کی عمر تیس برس سے زائد نہ تھی،

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے، عبید ایک شاعر جو امیر خسرو کا معاصر ہے کہتا ہے[1]،

غلط افتاد خسرو راز خامی — کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

امیر کی شاعری فطرتی تھی، وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوتے تھے، انکے باپ دادا، شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے، تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ اُن کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے، دیباچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

دراں صغر سن کہ دندان مے افتاد، سخن مے گفتم و گوہر از دہانم میریخت،

[1] بدایونی جلد اوّل صفحہ ۲۲۲ و ۲۲۳،

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

چوں مرا استادے سر آمدہ بر سر نیامدہ بود کہ بر سر دقایق دال شدے و

آہوے مشکبار قلم را از سواد خطا باز آوردے،

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے، استاد کی بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھ کر ان کا تتبع کرتے تھے، جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے، اسی انداز پر کہنا شروع کرتے، خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا، اس کے الفاظ حل کئے، لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہو سکا، پہلا دیوان بالکل بے اصلاحی ہے، امیر اس کو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہو گئے،

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے، ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے، شہاب کی پہلے نہایت تعریف کی ہے پھر لکھتے ہیں،

من بدو عرضہ کردہ نامۂ خویش ‌ ‌ او بہ اصلاح راند، خامۂ خویش

دید ہر نکتہ را رقم بر قسم ‌ ‌ رنج بر خود نہاد و منت ہم

نظرے تیز کرد موے شگاف ‌ ‌ نے بہ عمیا نظارۂ بگزاف

این دقایق کہ شد ز مغز ش پوست ‌ ‌ مو بمو شعر بیز کردۂ اوست

شمع من یافت ضیا از وے ‌ ‌ مس من گشتہ کیمیا از وے

ہر چہ او گفت من نہادم گوش ‌ ‌ بر کشیدم مگس ز شربت نوش

وانچہ بنمود من نہ جستم پے ‌ ‌ عیب آں بر من است نہ بر وے

یارب او چوں ز رنج نامۂ من ‌ ‌ برد بیروں خطاے خامۂ من

نامۂ او کہ حرز جانش باد در قیامت خط امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر خسرو مقلد نہ تھے، جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں اُستاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے، گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے ع

عیب آں بر من است نہ بر دے

کیا عجیب بات ہے وہ اُستاد جس کے دامن تربیت میں خسرو جیسا شخص پل کر بڑا ہوا آج اُس کا نام و نشان تک معلوم نہیں،

معاصر اُستادوں کے علاوہ خسرو نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے وہ اُن کے کلام کو سامنے رکھ کر کہتے تھے، اور اُسی طرح اُس سے فائدہ اُٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہے، اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی اوستادم در نسبت نقش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں،

خسرو مست اندر ساغر معنی بریخت شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ خسرو جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا،

کوکبۂ خسرویم شد بلند زلزلہ در گور نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی، اور خسرو کی طرف بڑھی خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا نام لیا، دفعتہً ایک ہات نمودار ہوا اور اُس نے آستین تلوار کے سامنے کر دی، تلوار آستین کو

کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی، یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہے اُسی قدر تاریخ کے بھی مخالف ہے، خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے، اسوقت اِن کی عمر ۴۷ برس کی ہوچکی تھی یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے، شباب کے زمانہ میں اُنہوں نے غرۃ الکمال مرتب کیا ہے اُس کے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں،

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی اُس میں لکھتے ہیں،

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر	وز دُر او سر بسر آفاق پُر
پختہ ازو شد چو معانی تمام	خام بود پختن سوداے خام
بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست	دین رہ باریک بہ پاے تو نیست
کالبدی داری او جان اندر دست	ہر چہ تو دانی بہ ازاں اندر دست
تا بود ایں سکّہ بہ عالم درست	بر تن تو کے بود ایں شُقّہ چست
مثنوی او راست ثناے بگوے	بشنوش از دور و دعاے بگوے
ایں ہمہ زانصاف نگر زور نیست	گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی اوستادم	در نیست منش حیات دادم

غرض امیر نے کبھی اساتذہ کی استادی سے انکار نہیں کیا وہ تمام استادوں کا نہایت ادب کرتے تھے مطلع الانوار میں جو کہہ دیا ہے وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی،

امیر کی حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں اور ایسی بے لاگ راے دیتے ہیں کہ ان کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزادانہ راے

نہیں دے سکتا، قران السعدین میں اُنہوں نے کیقباد اور بغراخاں کا حال لکھا ہے، لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے، اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں،

وصف بر آں گونہ فرو راندہ ام — کز غرض قصہ فرو ماندہ ام
عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام — کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام
چوں منم اندر قلب کان خویش — معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب یکے نیست کہ جویند باز — چوں ہمہ عیب است چگویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعر کی کئی قسمیں ہیں،

اُستاد تمام[1]، جو کسی طرز خاص کا موجد ہو، جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی،

اُستاد نیم تمام[2]، خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں، لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے،

سارق[3]، جو اوروں کے مضامین چُراتا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ اُستادی کی چار شرطیں ہیں،

طرز خاص[1] کا موجد ہو، اس کا کلام[2] شعرا کے انداز پر ہو، صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو، غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو،

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت اُستاد نہیں، اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں، یعنی میں سرقہ نہیں کرتا، اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں، لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں، اوّل تو میں کسی طرز خاص کا موجد نہیں دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا، خود اُن کے الفاظ یہ ہیں،

بندہ را ازاں چہار شرطِ اُستادی کہ گفتہ شد اول شرطے کہ ملک طرز است بر حکم ماجراے کہ در مجراے قلم جریان یافت، کہ چندیں استاد را متابع کلمات بودہ ام،

چوں پس رو طرز ہر سوادم پس شاگردم نہ اوستادم

و شرط دوم آنکہ در نافۂ سواد، بوے خطا نہ باشد ازاں نیز دم نتوانم زد، کہ نظم بندہ اگرچہ بیشتر روان است، اما جا بجا در غزل ولغز یدنی ہم است، و دریں دو شرط معترفم کہ از لافِ اُستادی قرعہ بر فال نتوانم غلطانید،

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے، امیر کے کلام پر ریویو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے،

امیر نے یہ بتایا ہے کہ وہ اصناف سخن میں سے کس صنف میں، کس کے پیرو ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے،

غزل، سعدی

مثنوی نظامی

مواعظ و حکم، سنائی و خاقانی

قصائد، رضی الدین نیشاپوری، و کمال اسمٰعیل خلاق المعانی،

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا مُنہ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قران السعدین و اعجاز خسروی) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی ہے، اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے،

امیر نے شعر و شاعری کے متعلق دیوانوں کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن

سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح دی ہے، فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں،

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزون ہو جائے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذراسی کمی بیشی کی برداشت نہیں کر سکتے،

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے متعدد مترادف الفاظ ہیں، اس لئے شاعری آسان ہے، ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے، بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں، باوجود اس کے فارسی شعرا پر میدان شاعری تنگ نہیں،

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے، ردیف نہیں،

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے، وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں، لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا، اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے، ردیف کی سرے سے ضرورت نہیں، نرے قافیہ پر مدار ہے، جس قدر قافیے ملتے جائیں کہتے جاؤ، ان سب وسعتوں کے ساتھ، عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی،

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا، لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے، زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے، لیکن زباندانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے، فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں کہ "اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے

پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جاتے،

امیر خسرو فن شاعری میں، جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں، خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی و نظامی، مثنوی میں، انوری اور کمال، قصائد میں، سعدی اور حافظ، غزل میں یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہات ڈالتے ہیں، تو پھیکے پڑ جاتے ہیں، بخلاف اس کے امیر، قصائد، مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں، مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک اُن کا جواب نہیں ہوا، غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے، مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں، تفصیل اس کی آگے آتی ہے،

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں، مثلاً، قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میووں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پہ ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں جن سے اُن کی تصویر، آنکھوں میں پھر جائے، امیر خسرو نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا ہے، انہوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں، اور اس کتاب سے اُن کا بڑا مقصد اسی قسم کی شاعری کا نمونہ قایم کرنا تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں،

بود در اندیشۂ من چند گاہ	کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم	مجمع اوصاف خطابش دہم
طرز سخن را روشِ نو دہم	سکہ ایں ملک بہ خسرو دہم

سکر خود نزیں فن اندیشہ زاے　　تا نہ نشانم نہ نشینم ز پائے

وصف نہ زاں گونہ شماز دل بروں　　کان دگرے را بدل آید کہ چوں

اس قسم کی شاعری کا نام امیر نے "وصف نگاری" رکھا، اور یہ نہایت موزون نام ہے اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا، بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھایا ہے، تاہم جس قدر ہے، غنیمت ہے،

کاغذ کی تعریف،

کاغذ شامی[1] نسب و صبح دام　　آنکہ شد آرائش صبحش ز شام

سادہ حریرے ولے اصلش ز خویش　　با قصب و خز شدہ پیوند چویش

تا بے حریر آمادہ اندر نورد　　طرفہ حریرے کہ توان جز و کرد

آمدہ اجزاش فراہم ز آب[2]　　لیک پراگندگیش ہم ز آب

بسکہ شد از کوبش بسیار پست　　پشت دو تا گردوش از یک شکست

گہ بود از دستۂ تیغش گزر　　گہ دہد از تیغ بہ مقراض سر

گہ خلۂ سوزن مسطر کشد　　گہ کشش رشتۂ دفتر کشد

حرف بحرف از قلم آرد سخن　　لیک بہ پیچد ہمہ بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں، ہم نے قلم انداز کر دیئے،

کشتی کی تعریف،

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا،

[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے، پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا،

ساختہ از حکمت کار آگہان　　خانۂ گردندہ بہ گرد جہان

نادرۂ حکم خدائے حکیم　　خانہ روان، خانگیانش مقیم

اہل سفر را ہمہ بروے گذر　　ہمرہ او ساکن و او در سفر

جاریۂ ہند زبانش سلیم　　حامل چندین بچہ، لیکن عقیم

بیشتر از مرغ پرد، در گشاد　　بیشتر از باد رود، روز باد

رفتہ دو منزل بہ دمے، بل دو چند　　بارسن و سلسلہ و تختہ بند

ہمچو کلنگان بہ ہوا سر فراز　　پر چو حواصل زدہ سو کردہ باز

ہر طرفش رہ بہ شتاب دگر　　ہر قدمش بر سر آب دگر

گرچہ بدریا گذر و بیش و کم　　آب نباشد مگرش تا شکم

دست چو در آب فراز افگند　　آب بدست آرد و باز افگند

لطمہ زدہ بر رخ دریا بہ زور　　آب ازاں لطمہ بہ فریاد و شور

در رہ بے آب نداند شدن　　کیست کہ بے آب تواند شدن

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے، لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں اُن کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں،

امیر نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں، چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

تشبیہات نو بسیار است این مجمل جملہ را تحمل نتواند کرد، اما دو سہ نظیر برائے یاد کردن گرد شدہ،

اس کے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں،

زانتظار دو ماہی ساق تو صد چشم | بزیر ہر مو دارم چو دام ماہی گیر
مژہ ہائے کہ ژدل آویزنت | کہ ہائے دکان قصاب است
زہے خرامش آں نازنین بعیاری | کبوترے بہ نشاط آمد ست پنداری

امیر چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اس لئے تشبیہات میں ان کو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی، اخیر شعر غالباً اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے۔ فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے، ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے۔ لیکن کبوتر مستی کی حالت میں جس طرح چلتا ہے وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے،

قصیدہ، مثنوی، غزل میں انہوں نے جو جدتیں پیدا کیں، ان کی تفصیل علیحدہ عنوانوں میں آگے آتی ہے،

مثنوی مثنوی میں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، نظامی کے پیرو ہیں، نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں، رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، خسرو نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے،

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص ان کے سوانح نگار کا کام ہے۔ البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے،

قران السعدین، یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی، اس لئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت بلند روانی اور برجستہ ہے، مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا، یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط و کتابت اور حملہ کی تیاری، بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحب تخت تھا، اور اسی کی فرمایش سے یہ مثنوی لکھی گئی، بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں، جنکو وہ اپنی دلیری کے

کارنامے سمجھتا تھا، لفصل اور آب و رنگ کے ساتھ لکھی جائیں، اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے، تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے، اس جھوٹی منطق کو امیر نے جہاں تک ہو سکا، خوب نباہا ہے، چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں،

گر بہ گہر تاج ستانِ توام — عیب مکن گوہر کانِ توام
چوں سرم از بخت سرافراز گشت — تاج تو بر تارکِ من باز گشت
تخت جہان بہر تو برپاے کرد — لیک بران تخت مرا جاے کرد
ملک بہ میراث نیاید کسے — تا نزند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نام پدر روشن است — خطبۂ جد بین کہ بنام من است
ہر دو جوانیم من و بخت من — با دو جوان پنجہ بہم درمزن
گرچہ بروبیت نہ کشم در ستیز — از پئے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کیں آورم — شیر فلک را بزمین آورم
جز تو کسے گر دم ازیں در زدے — سرزنش تیغ منش سر زدے
لیک توئی چوں بہ پلے ایں سریر — من ندہم گر تو توانی بگیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح حرف حرف، پدرانہ محبت کے نشے سے چور ہے،

اے ز نسب گشتہ سزاے سریر — وز پسرے ہیچو پدر بے نظیر
گرچہ غبار است ز کار توام — سرمۂ چشم است غبار توام
تا تو نہ دانی کہ دریں گفتگوے — از پئے ملک است مرا گفتگوے
گرچہ توانم ز تو ایں پایہ بُرد — از تو ستانم بکہ خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایام تو — من ز تو و نام من از نام تو

باش بکامم کہ بہ کام توام | زندہ و نازندہ بنام توام
خواہمت از جان کہ پناہے مرا | ور تو بخواہی و نخواہی مرا
جز بہ تمنائے تو سودائم نیست | بہتر ازیں ہیچ تمنّام نیست
گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک | تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دورم ز توائے نیک بخت | نے خوشم از تاج و نہ شادم ز تخت
بخت من ار پائے برافلاک سود | با تو چو یک دم نہ نشینم چہ سود

ان خاراگداز، الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا، اب اس کا لہجہ بدل جاتا ہے، اور فرزندانہ جوش محبت میں کہتا ہے،

من کہ گلے رستہ باغ توام | پرتوے از نور چراغ توام
گرہمہ بر ماہ رسد افسرم | ہم بہ تہ پائے تو باشد سرم
زابر وخود کن تو اشارت بہ چین | من سر خاقان فگنم بر زمین
تاج ز من، سر ز تو افراختن | عاج ز تو، تخت ز من ساختن
در بہ ملاقات رہی رائے تست | افسر من خدمت پائے تست
نیست مرا آں محل و آں شکوہ | کز سر خود سایہ فشانم بہ کوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا، باپ کو دیکھ کر بے اختیار تخت سے اُترا اور باپ کی طرف بڑھا، باپ نے چھاتی سے لگا لیا، دیر تک دونوں جوش محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے، پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا،

گرم فرو جست ز تخت بلند | کرد بہ آغوش تن ارجمند
داشت بہ آغوش خودش تا بہ دیر | سیر نہ شد چوں شود از عمر سیر

باخودش از فرش بہ اورنگ برد	تخت کیان باز کیان را سپرد
گاہ زدیدہ بہ نثارش گرفت	گاہ دوبارہ بہ کنارش گرفت
گاہ نظر بر رخ زیباش کرد	گاہ دل از مہر شکیباش کرد
پرسش از اندازہ زغایت گزشت	حد نوازش زعنایت گزشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کیساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئیں ہیں، اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا،

خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار، شیریں، خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینہ اسکندری، ہشت بہشت،

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں، یہی اُن کی تصنیف کی ترتیب ہے، چنانچہ امیر نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے، ان پانچوں کتاب کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے، اور یہ قادر الکلامی اور پُرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے،

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے ان میں نسبتہً امیر کا خمسہ سب سے بہتر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض، نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں، مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر کے دل میں بھی بے اطمینانی تھی، آئینہ اسکندری میں لکھتے ہیں،

دگر باز گیری تو پیوند خویش	مرا خود عزیز است فرزند خویش
سزد گرچہ آواز خر، خندہ را	بود ار غنون گوش خر بندہ را

بر و باد بخشایش دادگر — کہ بر من بہ بخشش گمارد نظر

ہنر جوی و در عیب جوئی مکوش — ترا نیز عیبے است بر خود بپوش

نظامی کے پُرزور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ ہیں، ان کی زور طبع کا یہ نمونہ ہے،

بہ گردون شد از نالۂ زرین خروش — بہ دریائے لشکر در افتاد جوش

ہزاہز در آمد بہ ہر دو سپاہ — روا رو در آمد بہ خورشید و ماہ

علم سر ز عیوق بر تر کشید — سنان چشم سیارہ بر بر کشید

بیابان ہمہ بیشہ شیر گشت — جہانے پر از شیر و شمشیر گشت

غبار زمین کلہ بر ماہ بست — نفس را درونِ گلو راہ بست

چناں گشت (پردہ) روئے ہوا گرد ناک — کہ سیّارہ گم کرد خود را بہ خاک

سپاہ از زرہ موج زن تا بہ اوج — چو دریا کہ بادش در آرد بہ موج

بدریائے آہن جہان گشتہ غرق — ہوا پر ز میغ و زمین پر ز برق

ز بانگ ہیونان گیتی نورد — شدہ پر صدا گنبد لاجورد

عرق کردن توسنان در شتاب — ز دریائے آتش بر انگیخت آب

شرارہ کہ زد نعل ہنگام رو — ستارہ بر دن ریخت از ماہ نو

نفیر زہ از چاشنی کمان — شدہ چاشنی بخش جان، ہر زمان

گرہ بر گرہ دشت پیکان زنان — زرہ بر زرہ پشت روئین تنان

ز بر بر سپر تیغ رخشاں ز تاب — چناں کز تہ برگ نیلوفر، آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں، مثنوی امیر کا اصلی مذاق نہیں، سلاطین کی فرمایش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹالتے تھے، چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا

ہے اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے،

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا، اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی، میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے

مسکین من مستمند بیہوش | از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود رائے | پیش چو خودی ستادہ برپائے
تا خون نہ رود ز پائے تا سر | دستم نشود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب اُن کے خاص مذاق کی ہے، یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی اُنہوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے،

مے داد چو نظم نامہ را پیچ | باقی نہ گذاشت بہر ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اسقدر نازک ہے کہ خود وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں،

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں، اور ان کا کمال دکھلایا ہے مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھلاتے ہیں،

آتش زدہ گشتہ کوہ و کان ہم | تفسید زمین و آسمان ہم
جائے نہ کہ دیدہ را برد خواب | ابرے نہ، کہ تشنہ را دہد آب
مرغان چمن خزیدہ در شاخ | دررفتہ چرندگان بہ سوراخ
ریگ از تف پختہ در گرانی | چوں تابہ روز میہمانی

از گرمی ریگهاے گردان | پُر آبلہ پاے رہ نوردان

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھ کر کونسا موقع مل سکتا تھا، اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پُر درد غزل ہے، سگ لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعرا نے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے امیر خسرو نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے مجنوں، کتے سے خطاب کرتا ہے،

ہستیم من و تو ہر دو شب گرد | لیکن تو بنالہ و من از درد

چوں باز گذر کنی دراں کوے | بر خاک درش زمن نہی روے

ہر خس کہ برو گذاشت گامے | از من برسانیش سلامے

ہر جا کہ نہاد پاے روشن | زنہار بہ بوسی از لب من

خواہد چو ترا درون دہلیز | ضرور یادش دہی از سگ دگر نیز

زنجیر خودت نہد چو بر دوش | از گردن من مکن فراموش

اس پیرایۂ ادا کو دیکھو، کہتے ہیں کہ جب لیلےٰ تجھ کو ڈیوڑھی کے اندر بلاے تو ایک اور سگ در کو یاد دلا دینا، جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھنا میری گردن کو بھول نہ جانا،

عاشق کا پیغام و سلام سب لکھتے ہیں، لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے اور کیونکر لکھتا ہے نہایت نازک مقام ہے، دیکھو امیر خسرو اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں، لیلیٰ مجنوں کو لکھتی ہے،

اے عاشق دور ماندہ چونی | وے شمع ز نور ماندہ چونی

روزت دانم کہ شب نشان است | شبہاے سیاہ بر چہ سان است

از من بکہ مے بری حکایت	باخود نہ کہ مے کنی شکایت
در گوش کہ ؟ نالہ مے رسانی	در پائے کہ قطرہ مے نشانی
بازار تو در کدام سوے است	سیلاب تو در کدام جوے است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور درد دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، اب اُس کی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے ؟ کس سے درد دل کہتا ہے کس کے آگے میرا نام لیتا ہے، یہ باتیں تو رازداری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

آئینہ سکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی اُن کے مذاق کا جو میدان آیا ہے اس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں، نظامی نے سکندر اور بت چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے، خاص اس موقع پر خوب زور طبع دکھایا ہے، جہاں وہ دلرُبا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے،

خسرو نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے، اور اسی طرح بت چینی کا فخریہ لکھا ہے نظامی کے فخریہ سے ملا کر دیکھو معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے،

مشعبد کہ داند جہان سوختن	زمن بایدش بازی آموختن
ہمہ خون خوباں کشس مے خورم	وے نوش بادم کہ خوش مے خورم
رخ ہر صنم ناپدید از من است	صنم خانہ ہا را کلید از من است
سپہر آفتاب زمین خواندم	وگر ماہ بیند، ہمیں خواندم
سکندر کہ گرد آب حیوان ہوس	نظیر منش بود مقصود و بس

گر او ہست کیخسرو جام جوے	مرا جام گیتی نماے است روے
گر از مجلس او سمن مے دمد	مرا لالہ و گل، ز تن مے دمد
گر او راست بر تخت، پاے نشست	مرا در دلِ او ست جاے نشست
گر او تاج خواہد ز شاہان خراج	من از سروران، سر ستانم نہ تاج
گر اقبال و دولت در ایا ورند	مرا ہر دو چوں کمترین چاکرند
گر او دشمنان را بخون خوردن است	مرا خون صد دوست در گردن است
گر او را یک آئینہ بر کف نشست	دو آئینہ دارم من از پشت دست
کمان وے ار صد شکار افگند	یک ابروے من صد ہزار افگند
کمند وے ار صید بندد مُدام	من آنم کہ صیاد گیرم بدام
گر او را کلاہے است بر آسمان	مرا صد کلاہ است بر آستان

ہشت بہشت — یہ سب سے اخیر مثنوی ہے اور امیر کی شاعری اس میں پختگی اور پرکاری کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے، خاص جو بات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے، ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں، لیکن التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا جائے، اس کے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جنکے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوئی جاتی ہے، ادا کئے جائیں،

تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی،

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سُنار تھا، اس کو بادشاہ نے ایک جرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا، حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی، حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا، جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر

کسی چیونٹی کے منہ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے، اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے چیونٹی تار کو لئے ہوئے اوپر چڑھتی چلی گئی، حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لیکر اس سے رسی بٹی، اور پھر ایک خاص تدبیر سے اُسی کے سہارے نیچے اُترا، تمام قصہ بہت لمبا ہے ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں،

چوں نگہ کرد خواجہ از بالا | گرزنش در رسید با کالا
دادش آواز گفت بر سر تار | پارۂ قند کن بزودے یار
دہ بمورے کہ مے رود بہ میل | تا ببالاش مے رود تعجیل
رشتہ را زود زود مے کن باز | گر نشیب آورد بسوے فراز
ہمچناں کرد زن کہ او فرمود | داد رشتہ بمور و مور ربود
راند بالاے میل تار کشاں | رسن فتنہ بر حصار کشان
چوں بہ نزدیک سار خنہ رفت بزور | ریسمان را ربود خواجہ زدور

قصائد قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے، کمال اسمٰعیل، خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں اور جس کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں، اس کا تتبع کرتے ہیں، خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے،

مجلس دو آتش دادہ برایں از شجروان از حجر | ایں کرد منقل را مقروان جام را جا داشتہ

اس کے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے، وہی انداز، وہی ترکیبیں، وہی استعارے ہیں اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے، اس لئے ۷۰ شعر کہہ کر دم لیا ہے، اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے، عید کا بیان کیا ہے، اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے،

ہر سو جوانان نو سلب ہر سو عروساں در قصب | طفلان نہ خفتہ از طرب دیدہ بہ فردا داشتہ

لباس

از شیر و خر مامرد و زن، در شهر خوار ہی تن بہ تن ‏ ‏ چوں شیر خوران در دہن، پستان، خرما داشتہ

خورشید چوں سر بر زدہ، ہر کس براہے در شدہ ‏ ‏ ایں رو بہ سوئے مے کدہ، او در مصلا داشتہ

فاسق کہ مے ناخوردہ گہ، در عید گہ بیہودہ رہ ‏ ‏ سر بر بساط سجدہ گہ، دل سوئے صہبا داشتہ

داروئے معلول است مے، بل جان محلول است مے ‏ ‏ خورشیا منخول است مے، در طاس مینا داشتہ

ان کے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے اُن کو پسند نہیں، صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں، اس لئے قصیدہ میں اور اور مضامین کو لیتے ہیں اور ان میں زور طبع دکھاتے ہیں، مثلاً بہار کا سماں، برسات کی رُت، صبح و شام کی کیفیت، ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔

ابر بارید و ہمہ روئے زمین را تر کرد ‏ ‏ خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستان فرمود ‏ ‏ بساط خاک ز دیبا و پرنیان فرمود

چو روئے نازک گل تاب آفتاب نداشت ‏ ‏ زمانہ بر سرش از ابر، سایہ بان فرمود

زلالہ خواست چمن ساغر و سبک بخشید ‏ ‏ ز ابر خواست زمین شربت و روان[1] فرمود

ہر آنچہ در ورق خویش، غنچہ مشکل داشت ‏ ‏ بنفشہ گوشش نہاد و صبا بیان فرمود

صبح کا سماں،

سپیدہ دم کہ فلک روشنی بہ گیہان داد ‏ ‏ نسیم، غالیہ در دامن گلستان داد

چو چرخ پیر بہ رُخ زد سپیدی و سُرخی ‏ ‏ بدستش آئینہ داد آفتاب و خندان داد

درست مغربی آفتاب را کہ فلک ‏ ‏ نہاد زیر زمین بامداد تابان داد

---

[1] روان فرمودن، فوراً حاضر کرنا،

ستارہ راز چہ شد دیدہ خیرہ از خورشید — چو شب ز حقہ بیناش سرمہ چندان داد

غلام باد صبا ام کہ بامداد و پگاہ — صلاے عیش بعشرت سراے مستان داد

نوبہارست و چمن جلوہ چو حورا کردہ — ابر ہا ریختنی لولوے لالا کردہ

گرہ طرہ سنبل کہ صبا باز شدہ — دامن لالہ پر از عنبر سارا کردہ

برگل و لالہ چناں میرود آنگہ قمری — پاے آلودہ بخون پائچہ بالا کردہ

عاشقان رفتہ بگلزار و دل سوختہ را — بہ تکلف زگل و لالہ شکیبا کردہ

نوبہار امسال مارا روزہ فرماید ہمے — گل چنان تر دامن از مے لب نیالاید ہمے

بر دہان غنچہ گہ گہ مے زند بوسہ نسیم — کان شکر لب جز بہ بوسہ روزہ نکشاید ہمے

باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد — گل بہ خنارہ گفت آرے این چنین باید ہمے

نرگس رعنا قدح بر دست و چشم اندر ہوا — گوئیا میخوارہ ماہ عید را باید ہمے

گویا شراب خوار ماہ عید کو ڈھونڈھتا ہے

برسات

ہواے خرم است و ہر طرف باران ہمے بارد — نگویم قطرہ کز بالا گل ریحان ہمے بارد

نگون سر شاخہاے سبز گوئی دُر ہمے چیند — زبس کابر دُر افشان لولوے غلطان ہمے بارد

یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں یہ اُن کے رولنے کو جھکی ہیں،

چکان قطرہ ز سرہاے انار تر تو پنداری — کہ ہر دانہ کہ بودہ است اندرو، پنہان ہمے بارد

خوش آں وقتے کہ مطرب در سماع نیکوان سرخوش — خرامان درمیان سبزہ و بالان ہمے بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق میں ہیں، ان میں بحر الابرار جو بڑا اسیر حاصل قصیدہ ہے مشہور ہے، التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں دعوے اور اس کے ساتھ دلیل ہو،

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش در د سر است   ہر کہ قانع شد بہ خشک و ترشہ بحر و بر است

عاشقی رنج است و مردان را بسینہ راحت است   سلسلہ بند است و شیران را بہ گردن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلیف ہے لیکن مردوں کو وہی آرام وہ ہے، جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اس کا زیور ہے،

مرد پنہان در گلیمے بادشاہے عالم است   تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشور است

راہرو چوں در ریا کوشد مرید شہوت است   بیوہ زن چوں رخ بیاراید بہ بند شوہر است

نفس خاک نیست ہر گہ نور بالا بر تو تافت   سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ بر تارک خور است

کار ایں جا کن کہ تشویش است در محشر بسے   آب زیں جا بر کہ در دریا بسے شور و شر است

ناکس و کس ہر کہ حرص مال دارد دوزخی است   عود و سنگین ہر چہ در آتش فتد خاکستر است

اے برادر مادر و ہر ار خورد خونت مرنج   چوں ترا خون برادر بہ ز شیر مادر است

دہر خاکے را نمونہ مے کند کین مردم است   بحر آبے را غلولہ مے کند کین گوہر است

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدت طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں ان کے مخالص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں،

برسات کے ذکر کے بعد،

برآمد ابر در بخشش و گرزاں پایہ در غلطد   نگیرد ہیچ کس دستش مگر شاہ جہانگیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل از کم عمر شد گو باش دانی   کہ در خور کیست عمر جاودان را
نہال باغ شاہی رکن حق آنکہ   ز بزم اوست رونق بوستان را

کشادہ چہرہ کہ ماہے شدم بروئے زمین
در ملک نمودم کہ آسمان ایں است

طلوع صبح کا بیان کرکے،

صبح راگفتم کہ خورشیدت کجاست
آسمان روئے ملک پیچھو نمود

ندارد روئے آں نازک نگر ما ہیچ آسیبے
مگر در سایۂ رایات شاہ کامگار آمد

طلوع آفتاب کے بیان کے بعد:-

خورشید جہانگیر مپندار کہ در بزم
شمشیر کشیدہ ملک الشرق برآمد

قصائد میں امیر نے جس قدر جدید مضامین لطیف استعارات نئی نئی تشبیہیں گوناگون اسلوب پیدا کیے اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے، لیکن امیر اس میں بھی سب سے الگ ہیں،

بوستان بشگفت و روئے لالہ خنداں گشت باز
بر رخ گل طرۂ سنبل پریشان گشت باز

سبزہ خطے چند بہر خواندن بلبل نوشت
بلبل آنگہ از خط خوباں غزل خوان گشت باز

خون لالہ گوئیا خواہد چکیدن از تیغ کوہ
یا چکید آں خون کہ کوہ آلودہ دامان گشت باز

غزل، اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدما کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی سعدی نے غزل کو غزل بنادیا، امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانۂ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز ہوگئی ہے

غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز گداز، جذبات، معاملات عشق، عجز و نیاز، اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کیے جائیں، وہی زبان

ہو جس میں عاشق، معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، اس کے لئے یہ بھی ضرور ہے، کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں، جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی الجھاؤ نہ ہو، قریب الفہم خیالات ہوں، اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں، لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انہوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں، اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلا دیئے یہ سب اجمال تھا، تفصیل ذیل میں ہے،

بحروں کی موزونی وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی، سادگی، اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے، مثلاً،

سرے دارم کہ سامان نیست اورا ‎ ‎ بر دل دردے، کہ درمان نیست اورا
فرامش کرد عمرم روز رازانکہ ‎ ‎ شبے دارم کہ پایان نیست اورا
بہ راہ انتظارم بست چشمے ‎ ‎ کہ خوابے ہم پریشان نیست اورا

یار من دل ز دوستان برداشت ‎ ‎ مہر دیرینہ از میان برداشت
در دل او نہ کرد کار ارچہ ‎ ‎ سنگ از نالہ ام فغان برداشت
وے بہ تندی بلند کرد ابرو ‎ ‎ از پئے کشتنم کمان برداشت

آں دوست کہ بود برکران شد ‎ ‎ واں صبر کہ داشتم نہان شد
گفتم کہ اسیر گردی اے دل ‎ ‎ دیدی کہ بہ عاقبت ہمان شد
دل بردگرے نہم ولیکن ‎ ‎ عاشق بہ ستم نے توان شد

عاشقے را چو نامہ باز کنید ‎ ‎ نام من بر سرش طراز کنید
گر شما دین عاشقان دارید ‎ ‎ بعد ازیں پیش بت نماز کنید

گاہ مُردن، شنیدہ ام محمود | گفت رویم سوے ایاز کشید

داد من آں بُت طراز نہ داد | پاسخے نیز دل نواز نہ داد

خواب مارا بہ بست و باز نہ کرد | دل مارا بہ برد و باز نہ داد

تو چہ دانی نیاز مندی چیست | چوں خدایت بکس نیاز نہ داد

سوز و گداز

سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اُٹھ رہا ہے، اس میں کبھی معشوق سے اپنا حال کہتے ہیں، کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے آپ پر ان کو رحم آتا ہے،

ماجرا اے دوست پُرسیدی کہ چوں بگذشت حال | اے سرت گردم، چہ می پرسی بدشواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق، معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہہ کر اس کو رونا آتا ہے، ٹھہر جاتا ہے، رو لیتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے، اس کی تصویر کھینچتے ہیں،

خسرو است و شب افسانہ و یار و ہر بار | قدرے گریہ و پس بر سر افسانہ رود

زانوش خسرو بزیر سر نیافت | سر نہادہ بر سر زانو نخفت

اے آشنا کہ گریہ کناں پند مے دہی | آب از برون مریز کہ آتش بجان گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہئے، پھر دل پر غصہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کم بخت جو بات ہو نہیں سکتی اس کے کہنے سے کیا فائدہ، اس معاملہ کو باندھتے ہیں۔

غصّہ ام مے کشد اے دل سخن صبر مگوے | وہ چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد

حسد بردی اے دشمن! بعقل و دانش خسرو | بیا تا بر مراد خاطر خود بینی اکنونش

رنج اور غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جاسکتی، عاشق (جس کا

فضل وکمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلم ہے، عاشق ہو کر تمام اوصاف کو کھو چکا ہے، وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید بر آئی، اس کو کس مؤثر طریقہ سے ادا کیا ہے،

جان زتن بردے و در جانی ہنوز　　دردہا دادی و در مانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہ گہ روئے خود بنمایمت　　این سخن بیگانہ را گو، کاشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطان زند　　ورنہ رنجے بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے، اور بُرا نہ مان تو فقیروں پر بھی، "ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے،

کشتم از تیغ جفایش خویش را　　بر تو آسان کردم، و بر خویش ہم

من کجا خسپم کہ از فریاد من　　شب نمے خسپد کسے در کوے تو

صبر طلب مے کنند از دل عاشق　　ہیچو خراجے کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول لگایا جائے،

اے دیدہ چہ ریزی از برون آب　　کین شعلہ بہ جان گرفت مارا

اے خواب! برو کہ باز امشب　　سودائے فلان گرفت مارا

اے عشق کار تو بہ چو من ناکسی فتاد　　گویا کسے نماند جہان خراب را

دل ندارم غم جانان بچہ بتوانم خورد　　پیش ازین گرچہ غمے بود ولے ہم بودہ است

کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تو دوش بر من　　از شب تیرہ، خبر پرس کہ محرم بودہ است

بیا بر دوستان جانان قضا کن　　ہر آں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل باز سوئے آں بت بدخو چہ میرود　　آں خو گرفتہ باز دران کوچہ میرود

جان میرود زتن چو گرہ می زند بزلف | مردن مراست از گرہ او چہ میرود

گر ببینی دل ویران مرا | گوئیا ہیچ گہ آباد نبود

کافرے رخت دلم غارت کرد | شہر اسلام و مرا داد نہ بود
میرا انصاف نہ کیا گیا

کرشمہ چند کنی بر من آخر این جان است | نمے دمد ززمین و صبا نمے آرد

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد اہلی نے یوں دست درازی کی،

کرشمہ چند کنی با من آخر این جان است | نمے دمد ززمین ز آسمان نمے بارد

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم | پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدّت اسلوب

غزل کی ترقی کا نوروز، لطف ادا اور جدّت اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں۔ لیکن پھر وہ نقش اولین تھا، امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سینکڑوں نئے نئے پیرایے پیدا کر دیئے، جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے یوں ادا کرتے ہیں،

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز | دردہا دادی و درمانی ہنوز

مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایے میں ادا کرتے ہیں۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ | نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے، اسی مضمون کو دیکھو امیر نے کس انداز سے کہا ہے،

مے حاجت نیست مستیم را | در چشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بے خبر ہونا، عام مضمون ہے اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے،

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست　　او ہمیں کار رنگ و بو دارد

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اس کو یوں باز رکھتے ہیں،

ہنوز ایمانِ دل بسیار غارت کردنی دارد　　مسلمانی میاموز آں دو چشم نا مسلمان را

رخصت کیوقت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا،

مے روی و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشین کہ باران بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق،

گفتم چگونہ مے کشی و زندہ مے کنی　　از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نہ کرد

سعدی کا شعر ہے۔

دوستان منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہو سکتی تھی لیکن امیر نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا،

جراحت جگر خستگان چہ مے پرسی　　ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے،

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقہ سے ادا کرتے ہیں،

بتے و آفت تقوے و آخر ایں نمیدانی　　کہ در شہر مسلمانان نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے، بجائے اس کے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے، گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد

سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں، بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے،

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

جان زنظارہ خراب و نازا و زاندازہ بیش ما بہ بوئے مست و ساقی پر دہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا،

شراب لطف پُر در جام میریزدی و مے ترسم کہ زود آخر شود این بادہ و من در خمار اُفتم

اکثر جگہ، صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں،

چشم بد دور از چنان روئے کہ از و چشم دور نتوان کرد

مردمان در من و بیہوشی من حیرانند من در آں کس کہ ترا بیند و حیران نشود

گفتیم نا خوشش چرائی خسرو! چوں کنم؟ آں قد و آں بالا خوش است

گفتیم کہ ہمیں ترا غلامم گر ہست گناہ من ہمیں است

و ہنت ذرۂ کم از ذرّہ است رخ زخورشید ذرّہ کم نیست

ایہام یعنی ذو معنین الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں،

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

پیش ازیں بر خودم یقینے بود کہ دلم ہیچ دلستان نبرد

ق

تو بہ بُردی ہمہ یقین مرا بہ طریقے کہ کس گمان نبرد

دی روئے تو دیدم و نہ مُردم شرمندہ بکانارہ ام زرویت

دیگر سر آں نیست کہ من زہد فروشم ساقی قدحے بادہ کہ بر روئے تو نوشم

اکثر جگہ جملہ معترضہ یا شرطیہ جملہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں اور یہ اُن کا خاص

مذاق ہے،

بروائے بادا بوسے زن بر آں پائے دگر چیزے نگوید بر دہان ہم

غمزۂ تو بر صف سلطان زند ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

رشکم آید کہ برم پیش تو نام دگراں وگر انصاف بود پیش تو ہم نتوان گفت

کشتم از تیغ جفایت خویش را بر تو آسان کردم و بر خویش ہم

غمے دارم کہ باد از دوستان دور بحق دوستی کز دشمنان ہم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی

مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں[1]،

مخفی نماند کہ ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی شیرازی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم دارد مثل ایں بیت،

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست تا نداند رقیبان کہ تو منظوری

اما نا سخ نقوش مانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردید و اساس آں را بلند ساخت،

عشق و ہوسبازی میں جو حالات پیش آتے ہیں، ان کے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں اہل لکھنؤ نے اس کا نام معاملہ بندی رکھا ہے، بہرحال اس طرز کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے امیر خسرو ہیں،

شرف قزوینی، ولی دشت بیاضی، اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی کی حد تک پہنچا دیا، آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کئے ہیں،

خوش آں زماں کہ بہ دلیش نظر نہفتہ کنم چو سوئے من نگرد او، نظر بگردانم

---

[1] صفحہ ۲۵

غلام آں نفسم کا مدم چو خانہ او　　　بہ خشم گفت کہ از در کشید بیرونش

چو رفتم بر درش بسیار، دربان گفت ایں مسکین　　　گرفتار است شاید کین طرف بسیار مے آید

امیر خسرو کے کلام کی زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ہر قسم کے نازک ولطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کئے ہیں،

چند گو بندگہ گہ بہ دلش مے گذری　　　ایں حدیثے است کہ بہر دل ما نیز کند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو ؟ تم کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے، لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے بھی کہدیا کرتے ہیں اس لئے اعتبار کیونکر آئے،

جانا! اگر شبیت دہن بر دہن نہم　　　خود را بخواب ساز ومگو کین دہان کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے مُنہ پر مُنہ رکھ دوں تو اپنے آپ کو سوتا بنا لینا، یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا مُنہ ہے،

دل من مست بود و غصّہ دوست　　　گہے زانجام وگہ زآغاز مے گفت

اندک اندک گہ گہے با یار بودن خوش بود　　　ور میسّر گر دوم بسیار بودن ہم خوش است

تو شبینہ مے نمائی بہر کہ بودی ؟ امشب　　　کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

مست آں ز دو قم کہ شب در کوے خویشم دید و گفت　　　کیست ایں ؟ گفتند مسکینے گدائی مے کند

جان باد فدات آنا مرکز لعبت دو سہ بوسہ　　　گویم کہ یکے دیگر، گوئی تو کہ نتوانم

وعدہ مے خواہم و در بند وفا نیز نیم　　　غرض آنست کہ بارے بہ تقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال، عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک جُدا گانہ زبان پیدا ہوگئی ہے، جس کا نام علمی زبان ہے،

سعدی و نظامی وغیرہ کی بولنے کی زبان اگر قلمبند کی جاتی تو بوستان اور اسکندر نامہ

کی زبان سے صاف الگ نظر آتی، بلکہ آج اگر اس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہم کو سمجھنے میں دقت ہوگی، لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے، بے شبہہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے ہیں اس لئے ان کے لئے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کی جائے، خصوصاً غزل کی زبان، روزمرّہ اور عام بول چال ہونی چاہئے، کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے،

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا کہ روزمرّہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے، سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا گُر یہی ہے،

امیر خسرو کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں، اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آجاتے ہیں جو آج ہم کو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہم کو اس زمانہ کے روزمرّہ کے محاورات سے واقفیت نہیں،

دل بسے بُردۂ، نکو بشناس   آں کہ مجروح تر ازاں من است

یعنی تم نے بہت سے دل لئے ہیں، خوب غور کرکے دیکھو جو بہت زخمی ہو، وہی میرا دل ہے،

صبح روئے تو بد نیساں کہ بر آمد امروز   نیست امکاں کہ چو من خستہ تا شام کشد[1]

لب و دہان و رُخت ہر یکے بلائے دل اند   یکے دلم چہ کند، جانب کدام شود

یعنی تیرا لب، دہن، اور چہرہ، سب بلا ہیں، میرا دل کیا کرے، کدھر کدھر جائے،

[1] تا شام کشد یعنی شام تک زندہ رہ جائے،

گفتم اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوے — عاقبت رفت و ہماں گفتۂ من پیش آمد[1]

خلقے براہ منتظر جان سپردن اند — اے ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر
(ذرا باگ کو روکے ہوئے)

بوسہ گفت و زبان گردانید — خود ہمے گوید و ہمے گرداند

بوسہ دینے کو کہا اور پلٹ گیا، آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے

بوئے خوشم آید از تو در جیب — گل داری، یا ہمیں است بو بیت

تیرے بدن سے خوشبو آ رہی ہے، تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے

خشک سالے است درین عہد و فارالے اشک — زاں جاکہ کہ تو می آئی باران چہ چین است
جدھر سے تم آتے ہو ادھر بارش کیسی ہے

اے گل، دہن تنگت صد تنگ شکر چیزے — گل با تو نمے ماند در حسن مگر چیزے
ذرا سا

گویم غم و درد م بین گوئی کہ بتر خواہم — بسم اللہ اگر خواہی زین ہر دو بتر چیزے

چو سبزہ خویش را خط تو خواند جائے آں باشد — کہ گل از خندہ بر خاک افتد و غنچہ شکم گیرد

یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں،

دلم مے خواستی بر ہم عفاک اللہ چناں دیدی — مرا مے خواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد

اے صبا دی کہ فلانے بر چمن مے مے خورد — ہیچ یاد من گم گشتۂ زندانے نے کرد

از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم — بوے گل نیست کہ می آیدم ایں بوے کسے است

دل من دور نہ رفت است نکو مے دانم — باز جوئید ہمیں جاے کہ در کوے کسے است

مشتبہ مے شودم قبلہ ز رویت چہ کنم — کہ ز ابروے تو چشمم بدو محراب افتاد

تیرا چہرہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ میں دھوکا سا ہوتا ہے، کیونکہ مجھ کو تیرے ابرو سے دو محرابیں نظر آتی ہیں

[1] یعنی وہی میرا کہا سامنے آیا

رخ جمالہ رانمود و مرا گفت تو مبین زیں ذوق مست بیخبرم کان سخن چہ بود

سب کو مُنہ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ میں اس مزہ میں مدہوش ہوں کہ یہ کیا بات کہدی

ساکنان سر کوے تو نباشند بہ ہوش کان زمینے است کہ آنجا ہمہ مجنوں خیزد

زچشمت کاروانِ صبر من تاراج کافر شد مسلمانان کسے دیدا است کاندر شہر راہ افتد

مسلمانوں کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے،

بہ بازی سوے من آمد بہ شوخی دل زمن بستد بدو گفتم چہ خواہی گر دگفتا کار مے آید

عام محاورہ بکار مے آید ہے کار مے آید، امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا

حُسن تو عالمے بنجواہد سوخت ہم در آغاز مے توان دانست

نرخ کردی بر بوسہ جانی بندہ بخرید رائگان دانست

تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی میں نے خریدا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا

از بہر آں کہ لاف جمال تو میزناد صد بار لالہ بر دہن یاسمین زدہ است

ما جان فداے خنجر تسلیم کردہ ایم خواہی بہ بخش و خواہ بکش رای رای تست

ساقی بیار مے کہ چناں سوخت دل زعشق کز سوز ایں کباب ہمہ خانہ بو گرفت

راست کردی زابروان محراب مے نماید نماز خواہی کرد

ابرووں سے تو نے محراب درست کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے

من آں ترک طناز را مے شناسم من آں مایۂ ناز را مے شناسم

شبم تازہ شد جان بہ دشنام مستی تو لبودی من آواز را مے شناسم

باد صبا چو از رخ او زلف در ربود ابر سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد
دھوپ نکل آئی ہے

تو حال من ہم ازیں روے زرد بیروں بر کہ من بہ روے تو پیدا[1] نمے توانم کرد

[1] پیدا کردن، ظاہر کرنا؛

سالہا شد کہ نیابم خبرِ و در کو بیت — دل ویران شدہ را آیم و آواز کنم

من از سر زندہ کردم، گر تو یارا کیک سخنگوئی — تو می دانم نگوئی، لیک من گفتار میگویم

مجھ کو معلوم ہے کہ تم نہ کہو گے لیکن میں بات کہتا ہوں

دعوئ خون بہاے دل خویش مے کنم — یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کن

امیر نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اُن کے سوا کسی اور اہل زبان کے کلام میں نہیں ملتے، مثلاً

از گرہ او چہ میرود،

آواز کردن، پکارنا

گفتار میگویم، یوں ہی ایک بات کہتا ہوں،

مالا کلام کردن، کسی کو ساکت اور بند کرنا،

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے اُن کی زبان سے نکل جاتے ہیں، ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقرا پر اعتماد نہیں، اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے،

تسلسل مضامین

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے، قصائد کا موضوع مدح ہے، مثنویاں، قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں، قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں، عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں تو کیونکر کریں، اس کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے لیکن قدماء بلکہ متاخرین میں بھی اس کا بہت کم رواج ہوا، امیر خسرو نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی،

مثلاً عاشق، قاصد یا اپنے راز دار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ، دیکھو کس اشتیاق، کس حسرت کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں،

اے صبا باز بہ من گوے کہ جانان چوں است؟ — آں گل تازۂ و آں غنچۂ خنداں چوں است؟
با کہ مے میخورد آں ظالم و در مے خوردن — آں رخ پر خوے آں زلف پریشان چوں است؟
چشم بد خوش کہ ہشیار نہ باشد مست است — چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چوں است؟
بروے و زلف بت عیار کہ آں ہر دو خوش اند — دل دیوانۂ من پہلوی ایشاں چوں است؟
روز ہا شد کہ دلم رفت و دراں زلف بماند — یارب آں یوسف گم گشتہ بزندان چوں است؟

پوچھتے پوچھتے دفعتہً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلاف عاشقی ہے، اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے،

ہم بہ جانان و سر جانان کہ کم و بیش مگوے — گو ہمیں یک سخن راست کہ جانان چوں است؟

یعنی معشوق کی جان کی قسم اِدھر اُدھر کی باتیں نہ کہہ، صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے؟

معشوق نے روزہ رکھا ہے، اس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہوسکتے ہیں اُن کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

ماہ من روزہ میان شکرستان دارد — اے خوش آں روزہ کہ جا در لب جانان دارد
لب مے آلودہ دہان پر شکر نرگس مست — اے مسلمانان! کس روزہ بدینسان دارد
خضر گر بر لبش آید شکند روزۂ خویش — کان بسر ور نہ لب چشمۂ حیوان دارد
خون من میخورد آخر ز لبش پنہاں نیست — من گرفتم کہ خود او روزہ پنہان دارد
جان من گر تو قدم رنجہ کنی، بندۂ تو — قدرے آب دو چشم، و دل بریان دارد

معشوق سروسامان کے ساتھ سوار آرہا ہے، عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آرہی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں معشوق آتا ہے، لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہیگا اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہئے، ان خیالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں،

کہ می آید؟ چنیں یارب مگر مہ بر زمین آمد — چہ گرد است اینکہ می‌خیزد کہ با جان ہمنشین آمد
کہ می راند جنیبت را کہ میدان عنبر آگین شد — گذا ایں بادِ مے جنبد کہ بوئے یاسمین آمد
تبی و آفت تقوی دآخر ایں نمیدانی — کہ در شہر مسلمانان نباید ایں چنیں آمد

بہار آئی ہے عاشق باغ میں جاتا ہے، مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں، قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے، سبزۂ لب جو، اور عالم آب کی سیر قابل دید ہے، قاصد سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹالنا چاہے تو نہ ماننا، اور جس طرح ہوسکے ساتھ لانا، اور اگر عالم مستی میں ہو تو اسی طرح مست اُٹھا لانا، ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا ہے،

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش — وقتے است خوش بہار کہ وقت بہار[1] خوش
در باغ با ترانۂ بلبل دریں ہوا — مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش
مائیم و مطربے و شرابے و محرمے — جامے بزیر سایۂ شاخ چنار خوش
اے باد کاہلی مکن و سوئے دوست رو — مارا بکن بر آمدن آں نگار خوش
چیزے دگر مگوئے، ہمیں گو کہ در چمن — سبزہ خوش است و آب خوش و جوئبار خوش
گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گرد — پیشش کن و بیار مشو زینہار خوش

[1] وقت کسے خوش بودن، دعائیہ جملہ ہے، یعنی خدا اُن کو خوش و خرم رکھے،

دربینیش کہ مست بود، خفتنش مادہ — ہم ہمچنانش مست بہ نزد من آر خوش

من مست خوش حریفی ادیم کہ آں حریف — سرخوش خوش است و مست خوش و ہشیار خوش

با او دران زمان کہ منش راہ مے دہد — بازی خوش است و بوسہ خوش است و کنار خوش

سرو پیادہ خوش بود اندر چمن ولیک — آں سرو من پیادہ خوش است و سوار خوش

طبیعت[1]

بہار میں کیا کیا چاہیئے؟ اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں،

ہنگام گل است بادہ باید — ساقی و حریف سادہ باید

گر غنچہ گرہ در آبرو افگند — پیشانی گل کشادہ باید

ساقی برخیز، و یار بنشان — کین شستہ و آں ستادہ باید

شستہ[1]

وانگاہ، حریف سادہ و مست — در چنگ من اوفتادہ باید

بہار کا سامان،

بوستان جلوہ در گرفت اینک — گل ز رخ پردہ در گرفت اینک

آتشِ لالہ بر فروخت ز باد — دامنِ کوہ در گرفت اینک

بلبل آمد، نشست بر سر گل — بے نوا بود، زر گرفت اینک

غنچہ در پیش فاختہ ز اصول — سبقے تازہ بر گرفت اینک

موسیقی[1]

ورق غنچہ را کہ تر شدہ بود — در تش یکبار گر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ نم تھے اس لئے چپک کر رہ گئے،

آب را گرچہ چشم ہا پاک است — بوستان را ببر گرفت اینک

یعنی پانی گو پاک نظر ہے تاہم اُس نے باغ کو سینہ سے لپٹا لیا،

خار چوں تیز کرد پیکان را — گل بصد تو سپر گرفت اینک

طوطی آغاز شعر خسرو کرد　　　روے گل در شکر گرفت اینک

جدّت　جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، امیر کا دعویٰ ہے کہ اُنہوں نے سینکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں، اور یہ دعوے بدیہی دعویٰ ہے، ان کی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہ ہو، چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں،

راز خون آلود خویش اے دل منہ با من بروں　　　کین ورق خام است حرف از روے برون خواہد گذشت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا،

زلف او پہلوی خال لب او　　　گوئی از شہد مگس مے راند

نہ رود مہ براوج در شب تار　　　تا ز زلف تو نردبان نہ برد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا، جب تک تیری زلفوں کی سیڑھیاں نہ لگالے،

(چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے)

ہست صحرا چوں کف دست و بر او از لالہ جام　　　خوش کف دستی کہ چندیں جام صہبا بر گرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے،

دیدہ ام شاخ گلے بر خویش مے پیچم کہ کاش　　　مے توانستم بیک دست ایں قدر ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈالی پھولوں سے بھری دیکھی، اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہات میں اتنے ہی پیالے لے سکتا،

غلام نرگس مستم کہ بامداد و پگاہ　　　قدح بدست گرفتہ ز خواب بر خیزد

گلستان نسیم سحر یافتہ است　　　صبا غنچہ را خفتہ دریافتہ است

چناں خواب دیدہ است نرگس بخواب　　　کہ گویا یکے جام زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے، اس کو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہ تشبیہ عام تھی، لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جام زر ہاتھ آ گیا ہے ایک خاص لطف پیدا کر دیا، اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں اس لئے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے،

میروی دگریہ مے آید مرا ساعتے بنشین کہ باران بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آتے ہیں، لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کیوقت مجھ کو رونا آتا ہے، اتنا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے، اور اس میں مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اس لئے وہ جانا چاہیگا تو بارش ہوگی، اور اس لئے وہ کبھی نہ جاسکے گا،

مے میانِ شیشۂ ساقی نگر آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمدہ بہ ساغر لالہ شراب کرد در گوش ہائے باغ بسے دُرِّ ناب کرد

فراش باغ بارگہ خود بہ باغ زد وانگہ بر آب، خرگہ سیم از حباب کرد

نرگس کہ شب نخفت ز فریاد بلبلاں بنہاد سر بہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی

خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے، لیکن کمال کی جدت، قصائد کے ساتھ مخصوص ہے غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق امیزش نہیں کی ہے، غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنے امیر خسرو کا ایجاد ہے، اور اُنہیں پر خاتمہ بھی ہوگیا، متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں، لیکن اس کا دوسرا انداز ہے، وہ اور سلسلہ کی چیز ہے، چنانچہ آگے چل کر اس کی حقیقت کھلے گی،

امیر خسرو کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں، مثالوں سے اندازہ ہوگا،

بہ خانۂ تو ہمہ روز بامداد بود　　کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا

تیرے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا

زلف تو سیہ چراست　　بسیار در آفتاب، گشتہ است

مشتبہ مے شودم قبلہ ز رویت چہ کنم　　کہ ز ابروے تو چشم بارو محراب افتاد

چشم مست تو کہ دی بر من بیتاب افتاد　　تو نیفگندی از آلودگی خواب افتاد

زبہر آں چنیں تاریک باشد خانۂ چشم　　کہ ہرگز آفتاب من دریں روزن نمے آید

پیش تو آفتاب نتوان جست　　روز روشن چراغ نتوان کرد[1]

مے روے و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشین کہ باران بگذرد

دل من بہ زلف و رویت شد اسیر چوں نہ گردد　　شب ماہتاب دزدے کہ بہ خانۂ در آید

زہے عمر دراز عاشقان گر　　شب ہجران حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے،

زلف ازاں مے بُرد آں شوخ کہ شبہائے غمم　　گر شود کوتہ ازاں جا ہمہ پیوند کنند

یعنی اپنی زلف وہ اس لئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں، تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھا دے،

راہے است برائے بردن دل　　ابروے تو کز میان کشادہ است

یعنی تیرے دونوں ابروؤں کے درمیان میں جو فاصلہ ہے اس لئے ہے کہ دل لیجانے کیلئے راستہ رہے

زلفت سرو پا شکستہ زاں است　　کز سر دلبندت اوفتادہ است

---

[1] چراغ کردن، چراغ جلانا،

یک شب ز رخ خویش چراغیم کرم کن — تا قصۂ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم

یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اس کی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں

خانہ چشم من خراب شدہ است — کہ بہ بنیاد خانہ، نم رفتہ است

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکر لعل تو کان نمک است — گرچہ شکر نہ مکان نمک است

آب روے تو ملاحت افزود — گرچہ از آب زیانِ نمک است

خواہی ایجان بردہ خواہ بمن باش کہ من — مرونی نیستم امروز کہ جانان اینجاست

آئینہ کرد حسن وے از آسمان سوال — برخواست آفتاب و بہ زانو جواب کرد

یعنی اُسکے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے

سر ابروے تو گردم گرہش باز کشای — کہ کمانت نہ بہ اندازہ بازوے کسے است

ہر چند کہ زلف تو سپاہی است جہانگیر — زیں گونہ پریشان نتوان کرد سپہ را

بر سایہ خفتہ بدم من کہ یار آمد و گفت — چہ خفتۂ کہ رسید آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے،

ع دردہا دادی و درمانی ہنوز،

یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم

صنائع — امیر نے اعجاز خسروی میں صنائع بدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہم کو بڑا ڈر تھا کہ جو جال اُنہوں نے بچھایا اس میں خود بھی پھنس نہ جائیں، لیکن یہ عجیب حُسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اُس پر مستقل کتابیں لکھیں، مثلاً فرخیؔ

ابن المعتز وغیرہ وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے،

امیر خسرو، اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں، تاہم اُن کے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں، صنعت طباق یعنے اضداد اُن کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اُس کو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں،

ع درد ہا دادی و درمانی ہنوز،

اگر تو ہمنشین بندہ باشی ز بند دو جہان آزاد گردم

من درویش را کشتی بہ غمزہ کرم کردی الٰہی زندہ باشی

گفتیم ناخوش چرائی خسروا چوں کنم؟ آن شکل وان بالا خوش است

بندہ را در غم تو نیست خبر ہمہ یاران بندہ را خبر است

اے بزرگان شہر داد دہید خرد سالے بہ من کند بیداد

عربیت اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امیر کو عربی علم ادب میں کمال تھا، اور اس فن کی نادر کتابیں ان کے حافظہ میں مخزون تھیں، تاہم ان کو اس فن میں دعوے نہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں، جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود اعتراف عجز کے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے، اشعار یہ ہیں،

ذاب الفواد وسال من عینی الدم وحکی الدم واعم کل ما انا اکتم

دل پگھل گیا، اور آنکھ سے خون بہا اور آنسوؤں نے وہ سب کہدیا جو میں چھپاتا تھا

واذا اشتکیت لدی الوریٰ کرب النوی تبکی الاحبۃ والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے، فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں، اور دشمنوں کو رحم آتا ہے،

یا عاذل العشاق، دعنی باکیا　　ان السکوت علی المحب، محرم

او ناصح! تو مجھے رونے دے چُپ رہنا، عاشق پر حرام ہے

من بات مثلی فھوید ری خلیلتی　　طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے

اعجاز خسروی میں عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں، جن سے ان کی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں، لیکن یہ اُس زمانہ کا عام انداز تھا، تنہا اِن پر الزام نہیں آ سکتا،

وان انا الا من غزیۃ، ان غوت　　غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہرحال قبیلہ غزیّہ کا آدمی ہوں، غزیّہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں، اور وہ ٹھیک راستہ پر ہے تو میں بھی ہوں،

صنائع وبدائع امیر خسرو نے صنائع وبدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں، اگرچہ کوہ کندن اور کاہ برآوردن ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ ان کی محنت بالکل رائگان نہ جانے پائے، اُن کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے،

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں، لیکن فارسی میں اُن کا ادا کرنا اس لئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی، مثلاً صنعت منقوطہ یعنی عبارت میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو، امیر نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں، بعض فارسی میں تھیں، لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص لکھ نہ سکا امیر خسرو نے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں اُنھوں نے تصرفات کئے، اور بعض بالکل خاص ان کے ایجاد ہیں، چنانچہ ہم انہی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں،

دو رُو، یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ نقطوں کے ردّ و بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے

اور بامعنی ہو، امیر نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں، لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہے، اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں،

رسیدی، بدیدی مرا، دی بہ خانے   زمانے بباشی، بہ یاری بشائی

کل[۱] مکان[۲]

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے،

کل تو آیا اور تو نے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا، ایک ذرا ٹھہر جا تو دوستی کرنے کے قابل ہے،

لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں،

رشیدی، ندیدی، مرادی، نجاتی   زمانی بیاسِ نتبارِی نسائی

تو میرا ہدایت یافتہ ہے، بے نظیر ہے، میری مراد ہے، میری نجات ہے، مجھ کو اس بات نے ناامید کیا ہے کہ میری عورتیں باہم لڑتی ہیں،

قلب اللسانین، بہت سے اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں، لیکن اگر ان کو الٹا کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جائے، مثلاً،

بسے با کامرانی در جہان باش،

مے باش بہ کار شادمانی،

بائے یار ما کہ کارے کنیم بہم،

دوست ما یار منی بہ یاری ما آئی،

بکن داد دبکشور کامران باش

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتی ہے،

وصل الحرفین، یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں، ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے، بلکہ دو دو، یا تین تین، حرف کا لفظ ہو، مثلاً،

چاکر خاصہ، حاجی شرقانی، سر خدمت، بر پایت مے مالد، و مے گوید، کہ بدیں جانب خاطر ما با فرحت قرین مے باشد باید کہ گہ گہ جانب ما، نامہ فرماید، تا ہر خوشی کہ بر باست فرخی کامل بابید،

یہ اُس صنعت کا نقیض ہے، جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے، مثلاً

دَردوُر وداد آوِرد، ورُودار، دَارای دَراری دوَّار، ذات دوار ددران را، آلخ

امیر نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے،

امار بعۃ الاحرف، اس صنعت پر امیر کو بہت ناز ہے، کئی کئی سطروں کی با معنے عبارت لکھی ہے، اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف، ہ، واو، ے، کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے، یعنے تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں،

لیکن جو عبارت لکھی ہے، وہ بالکل سہل معلوم ہوتی ہے، اور اُس کا پڑھنا سخت مشکل ہے،

معجزۃ الالسنۃ والشفاہ، اس صنعت پر اور بھی ان کو ناز ہے اس میں ایسے الفاظ جمع کیے ہیں کہ سطریں کی سطریں پڑھتے جاؤ۔ لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے،

ترجمۃ اللفظ، یہ صنعت بھی خاص اُن کی ایجاد ہے، اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے، اُس کے بعد کا لفظ، دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے، مثلاً

سودائے رخ تو کشت مارا

یہ فارسی مصرع ہے، لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو "مارا" ہوگا اس لئے

مصرع کا اخیر لفظ، پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے، امیر نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے،

محتمل المعانی، ایک شعر میں ایک لفظ لاتے ہیں کہ اس کے سات معنی ہیں، اور ہر معنے وہاں مراد لئے جا سکتے ہیں،

موقوف الآخر، ایک رباعی لکھی ہے، جس کا ہر قافیہ، دوسرے مصرعہ کی آغاز کا محتاج رہتا ہے، مثلاً

در حسن ترا، کسے نماند اِلّا	خورشید کہ ہر صبح بروں آید، تا
خدمت کند، و پائے تو بوسد، امّا	بینی تو بسوے او، چو پا بوسد، تا

انہی صنعتوں اور بیجا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں، اگر کسی صاحب کو امیر خسرو سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے، مطالعہ فرمائیں،

سلمان ساوجی

وفات ۷۶۹ھ یا ۷۷۸ھ

عراقِ عجم میں سادہ، ایک مشہور صوبہ تھا، صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ "اب صرف چند قصبے باقی رہ گئے ہیں" سلمان یہیں کے رہنے والے تھے، عربی میں نسبت کے وقت ہ، ج، سے بدل جاتی ہے، اس لئے ساوجی کہلاتے ہیں، ان کا خاندان ہمیشہ سے معزز چلا آتا تھا اور سلاطین وقت انکا بہت احترام کرتے تھے، سلمان کے والد جن کا نام خواجہ علاء الدین محمد تھا، دربار شاہی میں ملازم تھے، سلمان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی حیثیت سے ہوئی تھی، چنانچہ دفتر کے کاروبار اور علم سیاق میں نہایت کمال رکھتے تھے اس زمانہ میں جو طوائف الملوک حکومتیں جا بجا قائم ہوگئی تھیں، ان میں ایک جلایر کا خاندان تھا، جس کا پایۂ تخت بغداد تھا، اس خاندان نے ۸۶ برس تک حکومت کی، اور چار شخص مسند حکومت پر بیٹھے، اس سلسلہ کا پہلا فرمانروا حسن ایلکانی تھا، حسن ایلکانی کے فرزند سلطان اویس جلائر نے بڑا جاہ اور اقتدار پیدا کیا، ۷۶۰ھ میں آذربائیجان، اران، موغان، شیروان، موصل وغیرہ فتح کر کے اپنے حدود حکومت میں داخل کر لئے، ۱۹ برس تک بڑے عظمت و اقتدار کے ساتھ حکومت کی، مختلف علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا، تصویر ایسی عمدہ کھینچتا تھا کہ بڑے بڑے مصور دنگ رہ جاتے تھے، خواجہ عبدالحی جو مشہور مصور گذرا ہے، اسی کا تربیت یافتہ تھا، علم موسیقی میں اکثر چیزیں اس

کی ایجاد ہیں، ان باتوں کے سوا حسن وجمال کا یہ حال تھا کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو راستہ تماشائیوں سے رک جاتا تھا، ۷۷۶ھ میں وفات پائی، خواجہ سلمان الٰہی دونوں کے دربار کے ملک الشعرا تھے،

خواجہ سلمان کی ابتدائی تقریب کا یہ واقعہ ہے، کہ اُنھوں نے حسن ایلکانی کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر بغداد کا قصد کیا، اور دربار میں پہنچے، ایک دن حسن تیراندازی کی مشق کر رہا تھا، سلمان بھی اس موقع پر موجود تھے، برجستہ یہ اشعار کہہ کر پیش کئے[1]،

چو در بار چاچی کمان رفت شاہ	تو گفتی کہ در برج قوس است ماہ
دو زاغ کمان با عقاب سہ پر	بہ بادام بیک گوشہ آوردہ سر
نہادند سر بر سر گوش شاہ	ندانم چہ گفتند در ہوش شاہ
چو از شست بکشادہ خسرو گرہ	بر آمد زہر گوشہ آواز زہ
شہا! نیر و ر بند ندبہ تیست	سعادت دوان در پے تیر تست
بعہدت زکس نالۂ بر نخواست	بغیر از کمان کو بنالد رواست
کہ در عہد سلطان صاحبقران	نکرداست کس زور جز بر کمان

حسن نے سلمان کی غیر معمولی قادرالکلامی دیکھ کر، مقربین خاص میں داخل کیا،

سلطان حسن کی حرم دلشاد خاتون نہایت قابل اور لایق عورت تھی، سلطان برائے نام بادشاہ تھا، سلطنت کا نظم ونسق دلشاد خاتون کے ہات میں تھا، وہ شعرا ورسخن کی بہت قدردان تھی، اس بنا پر سلمان کی نہایت قدردانی کرتی تھی، سلمان نے بھی اس کی مدح میں جی کھول کر زور طبع دکھایا ہے۔

---

[1] مجمع الفصحاء وتذکرہ دولت شاہ،

سلطان اویس کو شاعری کے ساتھ خاص مذاق تھا، خود شعر کہتا تھا، اور سلمان کو دکھاتا تھا، اس بنا پر سلمان نے اس کے دربار میں نہایت تقرب حاصل کیا،

ایک دفعہ سلمان رات کے وقت سلطان اویس کی مجلس عیش میں شریک تھے، جلسہ ختم ہوچکا تو سلمان اُٹھے، سلطان نے ملازم ساتھ کردیا کہ روشنی دکھانے کے لئے شمع ساتھ لے جائے، گھر پر پہنچے تو ملازم شمع وہیں چھوڑ آیا، صبح کو شمع لینے گیا، تو خواجہ صاحب اس بنا پر گھبرائے، کہ شمع کے ساتھ طلائی تھالی بھی تھی، وہ ہات سے جاتی ہے، اُسی وقت یہ شعر لکھ کر ملازم کو دیا، کہ سلطان کی خدمت میں پیش کرنا،

شمع خود سوخت بزاری شب دوش وامروز　　گر لگن مے طلبد شاہ زمن مے سوزم

سلطان نے ہنس کر کہا کہ شاعر سے کوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے[۱]

سلمان جب بہت ضعیف ہوگئے تو ملازمت سے استعفا دینا چاہا اور مسلسل چار قطعے لکھ کر پیش کئے،

بادشاہا! بندہ در حضرت برسم عرضداشت　　انبساطے مے نماید برامید رحمتت
قرب چل سال است تا اشکان شرق وغرب را　　طبع سلمان مے کند در گوش دُرِّ مدحتت
در ثنائے حضرتت عہد جوانی گشت صرف　　نوبت پیری رسید اکنوں برام حضرتت
گوشۂ خواہم گرفتن تا اگر عمرے بود　　چند روزے بگذرانم در دعاے دولتت
علت پیری و درد پا، وضعف جسم وچشم　　مے برود در دسر من بندہ را از خدمتت
گفتہ ام در باب خود فصلے دو سہ آنرا جواب　　چشم دارد بندہ از درگاہ گردون حشمتت

---

[۱] دولت شاہ،

قطعۂ دوم

اوّل آں است کہ چوں نیت عزلت دارد — بندہ زین دائرہ جمع، جدا خواہد بود
مدتے مالک مُلکِ شعرا بود بحق — زین زمان خادمِ جمع فقرا خواہد بود
پیش ازیں، در پئے مخلوق بسر مے گردید — بعد ازیں بر درِ معبود بپا خواہد بود
بندہ تا زندہ بود وجہ معاش بندہ — ہیچ شک نیست کز احسان شما خواہد بود
لیک دارم طمع آں کہ معین باشد — کہ مرا وجہ معیشت ز کجا خواہد بود

قطعۂ سوم

دیگر آں است کہ محبوب جہان مقری شاہ — آمد از بندگی شاہ کہ مے فرماید
رو بگو بندۂ دیرینۂ ما سلمان را — کہ بخواہ از کرمم ہرچہ ترا مے باید
بندہ برحسب اشارت الٰہی کردم و شاہ — داشت مبذول جہان کز کرم شاہ آید
وعدہ دین است ز دین من اگر ز انچہ کشد — ذمۂ ہمت خود شاہ بری، مے شاید

قطعۂ چہارم

دیگر از خرج ترا و دخل کمش قرضے چند — ہست و فرض است کہ قرض غربا باز دہد
بندہ را غیر درِ شاہ درِ دیگر نیست — قرض باید کہ ز انعام شہا باز دہد
وجہ ایں قرض کہ از من غربا مے خواہند — گرنہ خواہد ز تو سلمان ز کجا باز دہد

سلطان نے فی البدیہ پہلے قطعہ پر یہ شعر لکھا،

ہرچہ تا غایت بنام او مقرر بودہ است — ہمچناں باشد بنام او مقرر ہمچناں

دوسرے قطعہ پر یہ لکھا،

لہ بندگی کا لفظ اس زمانہ میں اس طرح بولتے تھے جس طرح آج کل بادشاہ کے لئے ہز مجسٹی کہتے ہیں،

وہ ایرین کہ در حدود رسیدہ است　　　بد ہندش کہ التماس وے است

غرض جاگیر اور تنخواہ کی بحالی کے ساتھ قرض بھی ادا کر دیا گیا[1]،

سلمان نے گوشہ نشینی اختیار کی اور جب تک زندہ رہے، ہر قسم کے تعلقات سے آزاد رہے، حسب روایت دولت شاہ ۷۶۹ھ میں وفات پائی، لیکن مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے دیوان سلمان کا ایک نسخہ ۷۹۱ھ کا لکھا ہوا دیکھا، اس کے خاتمہ میں ایک قطعہ تھا، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب قطعہ سلمان کا معاصر ہے، قطعہ یہ ہے،

محل آیت اعجاز پارسی، سلمان　　　کہ کرد ناطقہ پیش دمش بہ عجز اقرار

ندید بر سر شاخ گل سخن اصلا　　　بہار طبع چو او عندلیب خوش گفتار

نماز شام دوشنبہ ۱۲ از صفر بود　　　کہ نقد عمر بیک دم چو صبح کرد نثار

بساط دار قرار است سال تاریخش　　　چو کرد میل بسوئے بساط دار قرار

اس سے ۷۷۸ نکلتے ہیں،

ناصر بخاری اس زمانہ میں مشہور شاعر تھے، اور درویشانہ وضع رکھتے تھے، حج کو جاتے ہوئے بغداد میں آئے، خواجہ سلمان کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی، ان کو بھی ملنے کا شوق پیدا ہوا، ایک دن سلمان دجلہ کے کنارے عالم آب کی سیر کر رہے تھے، ناصر وہیں پہنچے، سلمان نے مزاج پرسی کے بعد نام و نشان پوچھا، ناصر نے کہا شاعر ہوں، سلمان نے فی البدیہہ یہ مصرع پڑھا،

ع دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ ایست

---

[1] یہ تمام تفصیل خزانہ عامرہ میں ہے،

ناصر نے برجستہ دوسرا مصرع پڑھا،

ع پائے در زنجیر و کف برلب مگر دیوانہ ایست[1]،

سلمان نے گلے سے لگا لیا اور کئی دن تک مہمان رکھا، ناصر باوجود کمال استادی کے سلمان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے،

عبید زاکانی، ہجو گویوں کا پیشوا، اُسی زمانہ میں تھا، ایک دفعہ خواجہ سلمان سفر میں امیرانہ ساز و سامان کے ساتھ ایک چشمہ کے کنارے خیمہ زن تھے، اتفاق سے عبید زاکانی کہیں سے آ نکلا، سلمان نے پوچھا کدھر سے آنا ہوا، عبید نے کہا قزوین سے، سلمان نے کہا، سلمان کا کلام کچھ یاد ہو تو سناؤ، عبید نے یہ شعر پڑھے،

من خراباتیم و بادہ پرست ۔۔۔ در خرابات مغان عاشق و مست

مے کشندم چو سبو دوش بدوش ۔۔۔ مے برندم چو قدح دست بدست

ساتھ ہی کہا، لیکن سلمان بڑے رتبہ کا شخص ہے، یہ شعر اس کے نہیں ہو سکتے، عجب نہیں، ان کی بیوی کا کلام ہو، سلمان بہت برہم ہوئے، لیکن قیاس سے سمجھا کہ عبید ہے، قسم دیکر پوچھا، عبید نے اقرار کیا، اور کہا کہ تم بے دیکھے لوگوں کی ہجویں کرتے ہو، یہ زیبا نہیں میں بغداد خاص اس غرض سے آیا تھا کہ تم کو ہجو گوئی کا مزہ چکھاؤں، تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے قصداً چھوڑ دیا، سلمان نے شکر گزاری کی، خود گھوڑے پر سوار کرایا، نقدی اور کپڑے دیئے، اس پر بھی ہمیشہ عبید کی ہجو گوئی سے ڈرتے رہے[2]،

کلام پر رائے ۔ سلمان کی کمال شاعری کا تمام اساتذہ نے اعتراف کیا ہے، خواجہ حافظ

[1] دولت شاہ تذکرہ ناصر بخاری،

[2] دولت شاہ حالات عبید زاکانی،

معاصر تھے، تاہم کہتے ہیں،

سر آمد فضلاے زمانہ دانی کیست | زراہ صدق ویقین نے زراہ کذب وگمان
شہنشہ فضلا بادشاہِ ملک سخن | جمال ملت ودین خواجہ جہان سلمان

سلمان نے شاعری کی عمارت کمال اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کی داغ بیل پر قائم کی اکثر قصائد انہی دونوں کے جواب ہیں اور اسی طرز میں لکھے ہیں، مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں، کہ سلمان کے اکثر مضامین، اساتذہ قدیم خصوصاً کمال اسمٰعیل سے ماخوذ ہیں، لیکن سلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جاے اعتراض نہیں، اور اس کی یہ مثال ہے،

معنی نیک بود شاہد پاکیزہ بدن | کہ بہر چند در و جامہ دگرگون پوشند
کسوت عار بود بازپسین خلعت او | کہ نہ در خوبیش از پیشتر افزون پوشند
ہنرست اینکہ کہن خرقۂ پشمین زبرش | بدر آرند و در واطلس واکسون پوشند

شاعری میں سلمان کا ایک خاص درجہ ہے، یعنے وہ قدما اور متوسطین میں برزخ ہیں اُن کا کلام، قدماء کے دور کا خاتمہ اور متوسطین کا آغاز ہے، انہوں نے کمال اسمٰعیل اور ظہیر سے زبان کی صفائی اور شستگی لی ہے، اور اس میں ایجاد مضامین کی رنگ آمیزی کی ہے مضمون بندی جو متوسطین اور متاخرین کا مابہ الامتیاز جوہر ہے، گو کمال نے شروع کی لیکن سلمان نے کمال کو پہنچا دیا،

سلمان نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے، مثنوی جمشید و خورشید، اُن کی مشہور مثنوی ہے، اس کا اندازہ اشعار ذیل سے معلوم ہوگا،

شگوفہ چو نازک تنے سیم بر | زصندوق چوبین بر آوردہ سر
بنفشہ چو مشکین سر زلف یار | بُریدہ ز بار خودش روزگار

بر آنم کہ سوسن پریزادہ است | زبان آورے خوب و آزادہ است

شنیدم کہ پروانہ با بلبلے | ہمے کرد در عشق گل، غلغلے

ہمے گفت کین بانگ و فریاد چیست | زبیداد معشوق ایں داد چیست

زمن عاشقی باید آموختن | کہ ہرگز نہ نالم از سوختن

بروز من و حال من کس مباد | کہ یارم رود پیش چشمم بباد

بباید بدان زندہ بگریستن | کہ بے یار خود بایدش زیستن

سلمان نے اگرچہ مثنوی، قصیدہ، غزل، سب کچھ لکھا ہے، لیکن اُن کی شاعری کا اصلی میدان قصیدہ گوئی ہے، ان کے قصائد کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱۔ زبان کی صفائی اور روانی کے ساتھ، ترکیبوں میں وہ چستی جو ان سے پہلے نہ تھی اور جو خاص متوسطین شعرا کا انداز ہے، مثلاً۔

خندہ زد دہنت، تنگ شکر پیدا کرد | سخنے گفت، البتہ لولوئے تر پیدا کرد

بود نایافت میان تو ولیکن کمرت | چست بربست میان اُو بزر پیدا کرد

پردہ از چہرہ برانداز کہ آن زلف سیاہ | در سپیدی عذار تو اثر پیدا کرد

باد نوروز نسیم گل رعنا آورد | گرد مشک ختن از دامن صحرا آورد

شاخ را باغ بہ نقش دُم طاؤس نگاشت | غنچہ را باد بہ شکل سر ببغا آورد

لالہ از دامن کوہ آتش موسےٰ بنمود | شاخ بیرون زگریبان ید بیضا آورد

از پئے خسرو گل، بلبل شیریں گفتار | نغمۂ باربد و صورت نکیسا آورد

سرو را باد صبا منصب بالا بخشید | لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

صبحگاہے کہ صبا مجمرہ گردان باشد | گل فرو کردہ بدان مجمرہ، دامان باشد

جامۂ سرو ز استبرق و سندس بافند	گر کنند، ز پیروزه و مرجان باشد
مے کند باد صبا طفل چمن را در خواب	ورنہ مهد شجرش بهر چه جنبان باشد
آب در رود، ادا ہاے تر و تازہ زند	مرغ بر عود سحر ساختہ الحان باشد

۲- دقیق اور نازک مضمون آفرینی جو متوسطین اور متاخرین کا کارنامۂ فخر ہے، چند[1] مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

دہن و دندان لب و خال کی تشبیہ

در درج دُر، عقیق لبت[2] نقد جان نہاد	جنس نفیس بود، بہ جاے نہان نہاد
قفلے ز لعل بر در آں دُرج زد لبت	خالت ز عنبر آمد و مہرے بر آن نہاد
باریک تر ز مو، کمرت را دقیقہ	ناگاه در دل آمد و اسمش میان نہاد

یعنی کمر بند کے خیال میں ایک مضمون یاد آیا جو بال سے بھی باریک تھا، کمر بند نے اس کا نام کمر رکھ دیا، مطلب یہ ہے، کہ معشوق کی کمر، درحقیقت ایک باریک خیال ہے،

جدت تشبیہ

بعد ازیں از گرہ زلف مغان، کن تسبیح	پس ازیں از خم ابروے بتاں کن محراب
خوش برا ہیچو حباب از مے گلگوں و منہ	ہیچ بنیاد بریں گنبد گردون چو حباب
مدتے گردش ایں دائرہ مارا، از ہم	ہیچو پرکار جدا کرد، و بہم باز آورد

حُسن تعلیل تشبیہ

غنچہ را پیش دہان تو، صبا خندان یافت	آں چنان بر دہنش زد کہ دہن پُرخون شد
پا ازیں دائرہ بیروں ننہم یکسر مو	گر سراپاے چو پرکار کنندم بدو نیم
دامن از من مکش اے سرو کہ چوں آب رواں	من سرے در قدمت مے نہم و مے گذرم

[1] اوپر جو اشعار گذرے ان کو مضمون بندی کی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہئے،

[2] یعنی تیرے ہونٹوں نے عاشق کی نقد جان کو موتی کے ڈبہ (دہن) میں رکھا، اسلئے کہ وہ نفیس چیز تھی، اور نفیس چیز کو ایسی ہی مخفی جگہ رکھتے ہیں، پھر ہونٹوں نے ڈبہ پر یاقوت کا قفل لگا دیا، اور تل نے آکر عنبر کی مُہر کر دی،

۳۔ مخلص یعنی گریز میں نئے نئے پیرائے پیدا کئے، ایک قصیدہ ہے جس کی ردیف دست ہے اور قافیے ہزار، نگار، بہار، اس میں گریز کا شعر ہے،

زلفت بہ عہد معدلت شہریار دست ۔۔۔ سودائی است ورنہ چرا مے کند دراز

تیری زلف سودائی ہے، ورنہ بادشاہ کے زمانہ میں دست درازی کیوں کرتی،

ایک قصیدہ میں تشبیب کے بعد کہتے ہیں،

روزی دشمن دارا سے مظفر شدہ است ۔۔۔ بعد ازیں غم مخور اے دل کہ غم امروز ہمہ

اب اے دل غم نہ کھا کیونکہ اب تو غم مظفر شاہ کے دشمن کی خوراک بن گیا ہے،

عیش اور رقص و سرود کا بیان کرتے کہتے ہیں،

جز تو در عہد شہنشاہ جہان راہ زنے ۔۔۔ مطربا راہ[1] طرب خوش بزن امروز کہ نیست

فتنہ آں بر بہ ہمہ وجہ کہ پنہاں باشد ۔۔۔ نیست پیدا، دہنت بر رخ، و در دولت شاہ

بجز از بخت خداوند جہان کس بیدار ۔۔۔ و در مستی است دریں دور نہ زیبد کہ بود

خم زلف تو مگر چتر شہ دادگر است ۔۔۔ سایۂ زلف تو بر چشمۂ خورشید فتاد

۴۔ مشکل مشکل ردیفیں ایجاد کی ہیں اور ان میں اسی روانی اور صفائی کے ساتھ کہتے جاتے ہیں، گویا معمولی ردیفیں ہیں، اس کے ساتھ ہر جگہ ردیف نہایت خوبی سے نمایاں ہوتی ہے، مثلاً،

منم امروز بلائے شب ہجران بر سر ۔۔۔ کردہ در کار تو چوں شمع دل و جان بر سر

دست آنم نہ کہ در دامنت آویزم دست ۔۔۔ تا مگر گستردم لطف تو دامان بر سر

سرو بر پائے تو مے میرد و مرغان چمن ۔۔۔ مے کنندش ہمہ شب نالہ و افغان بر سر

---

[1] راہ کے معنی راگنی کے بھی ہیں اور راستہ کے بھی، پہلے مصرع میں پہلے معنی لئے ہیں، اور دوسرے میں دوسرے معنے،

ماہ تابان تو باید شب مشکین بردوش | سرو رعنائے تو دارد گل خندان برسر
آفتاب تو اگر سایہ زمن باز گرفت | باز یابند مرا سایہ سلطان برسر

مدح کے بعد فخریہ کہتے ہیں،

شعرم از تربیت لطف تو جائے برسید | کہ نہندش، ہمہ اشراف خراسان برسر

دعائیہ ملاحظہ ہو،

تا زند خسرو گل، تخت زمرّد در باغ، | تاج یاقوت نہد لالۂ نعمان برسر
تیر باران کند، از روے ہوا قوس قزح | ہر دم آرد، سپر لعل، گلستان برسر
شجر روضۂ بخت تو چنان مثمر باد | کہ فلک را فگند سایۂ احسان برسر

اسی طرح دست، پاے، رو، وغیرہ ردیفوں میں قصیدے لکھے ہیں،

قطعات قصیدہ کی انتادایسی بُری پڑگئی تھی کہ اس میں بجز معشوق اور ممدوح کی مداحی کے اور کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا، جو شعرا، اور اور خیالات ادا کرنے چاہتے تھے وہ قطعات کے ذریعہ سے ادا کرتے تھے،

سلمان نے نہایت کثرت سے قطعات لکھے ہیں، اور اُن میں ہر قسم کے عجیب و غریب مضامین ادا کیے ہیں، افسوس ہے کہ سلمان کا جو دیوان بمبئی میں چھپا ہے، اسمیں یہی قطعات نہیں ہیں، جو دیوان کی جان ہے، ہمارے پاس جو قلمی مجموعہ ہے، اس میں سے بعض نمونے درج کیے جاتے تھے،

بادشاہ نے سلمان کو ایک سیاہ رنگ گھوڑا عنایت کیا تھا سلمان نے واپس دیا کہ دوسرے رنگ کا گھوڑا مرحمت ہو، داروغۂ اصطبل نے وہ بھی رکھ لیا، اس پر کہتے ہیں،

شاہا مرا بہ اسپے موعود کردہ بودی | در قول بادشاہان، فیلے دگر نباشد

اسپے سیاہ و پیرم دادند و من بر آنم | کاندر جہان سیاہے زاں پیر تر نباشد
آں اسپ باز دادم تا دیگرے ستانم | بر صورتے کہ کس را زین سر خبر نباشد
اسپ سیہ بدادم، رنگ دگر ندادند | آرے پس از سیاہی رنگ دگر نباشد"

ایک اور قطعہ میں گھوڑے کی ہجو کی ہے،

شاہا امید بود کہ خواہم بدولتت | بر مرکبے بلند و جان و روان نشست
اسپیم پیر و کاہل و کوتہ ہمے دہند | اسپے نہ آں چناں کہ توانم بران نشست
چوں کلک مرکبے سیہ و سست و لاغر است | جہل مرکب است بر اسپے چنان نشست
از بندہ مہتر است بہ سی سال راستی | گستاخی است بر زبر مہتران نشست

آنکھوں میں آشوب کی وجہ سے دربار میں جانا بند ہوگیا تھا، اس کی معذرت میں ایک قطعہ لکھا ہے،

خسروا خاکِ درگہ تو مرا است | از غبار زروے نیکو تر
لیک در عین حالتے کہ مرا است | غیبتم از حضور نیکو تر
حال چشمم بد است، دور از تو | چشمِ بد، از تو دور نیکو تر

بدن پر کپڑے نہیں رہے تھے، بادشاہ کو قطعہ لکھا،

اے زما مستغنی و از امثال ما | بر شما احوال ما پوشیدہ نیست
بر تنم پوشیدنے ایں ست و بس | بندہ را ہیچ از شما پوشیدہ نیست

بادشاہ نے ملبوس خاص، بدن سے اُتار کر بھیجا اور یہ شعر لکھا،

ہر چند ترا جامۂ ما پوشیدن | عیب است ولیکن ایں عیب بپوش

درد پا کی وجہ سے دربار میں نہ جا سکتے تھے، اس کی عذر خواہی کرتے ہیں،

بہر استقبال شاہ از فرق و سر، کردم قدم | خواستم تا رو بہ درگاہ ہمایون آورم

درد پائم گشت ازاں مانع کہ آرم درد سر　　　من کہ درد پاے دارم، درد سر چوں آورم

سلمان کی بدعات

سلمان سب سے پہلے شخص ہیں جس نے صنعت ایہام کو نہایت کثرت سے برتا، اس میں اکثر لطیف اور نئے نئے پیرایے پیدا کئے، مثلاً

باقد تو صنوبر در چشم من نیاید　　　او کیست تا قدت را قائم مقام باشد

کے تواند دلم از موے میان تو گذشت　　　کہ شب تیرہ و تاریک ہے بر کمرست

چشم سرمست ترا عین بلاے بینم　　　لیکن ابروے تو چیزے ست کہ بالاے بلاست

فتنہ در دور تو بیمار و ضعیف افتادہ است　　　آں چناں نیست کہ تا حشر تواند برخاست

باچنیں عارضہ و ضعف، تمناے نجات　　　دارم اما ہمہ موقوف اشارات شماست

سرو را باد صبا منصب بالا بخشید　　　لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

در بست باد لم دہن تنگ، او بہ ہیچ　　　و ایں چنیں مضائقہ بسیار مے کند

نیست سوداے سر زلف تو کار ہمہ کس　　　کاں طریقے است خم اندر خم و دل گیر و دراز

لیکن اکثر اس قدر بے اعتدالی برتی کہ ضلع جگت کی حد تک نوبت پہنچ گئی، سینکڑوں اشعار ہیں جن میں صرف رعایت لفظی سے کام لیا ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ بدعت مقبول عام نہ ہوئی ورنہ ایران میں بھی بہت سے امانت پیدا ہو جاتے،

غزلیں

سلمان کی غزلیں چنداں مقبول نہیں ہوئیں، ان سے پہلے سعدی کا رنگ عالم کو مسخر کر چکا تھا، اس رنگ میں وہ کہہ نہیں سکتے تھے، اس لئے مضمون آفرینی شروع کی لیکن لوگوں کے کانوں میں سعدی کی لَے گونج رہی تھی، اس لئے ان کی آواز خالی گئی، سعدی ہی کا رنگ جب خواجہ حافظ نے اختیار کیا اور اس شراب کو اور تیز کر دیا تو ع حریفان را نہ سر ماند و نہ دستار نمونہ کے طور پر ہم سلمان کی ایک دو غزل اور متفرق اشعار نقل کرتے ہیں۔

بہ سر کوے تو سوگند کہ تا سر دارم — نیست ممکن کہ من از حکم تو سر بر دارم

اے کہ در خواب غروری خبری نیست کہ من — ہر شب از خاک درت بالش و بستر دارم

ساغرم پر مے، و مے در سر، و دلبر کف دست — تو چہ دانی کہ من امروز چہ در سر دارم

گفتۂ در قدم من گہر انداز بہ چشم — اینک از بہر قدمہاے تو گوہر دارم

دل برو دلبر و در دام بلاش اندازد — دل ما برد، کنون تا بہ کجاش اندازد

چشم فتان تو ہر جا کہ بلا انگیزد — اے بسا کس کہ دراں عرصہ بلاش اندازد

ہر کجا مرغ دلے بال کشاید الحیال — بہ کمان خانۂ ابرو، ز ہواش اندازد

خوش کمندی است سر زلف شکن پر شکنش — دہ چہ خوش باشد اگر بخت برماش اندازد

عاقل آں است کہ در پاے تو اندازد سر — پیشتر زاں کہ فراق تو ز پاش اندازد

بوے گیسوے تو ہر جا کہ جگر سوختہ ایست — در پے قافلۂ باد صباش اندازد

ہر کرا درد بہ بیند اخت، دوا چارہ کند — کہ کند چارۂ سلمان چہ دواش اندازد

یک شب خیال چشم تو دیدیم ما بخواب — زاں شب دگر بہ چشم ندیدیم خواب را

غمزہ ات دل مے برد چشم توام خون مے خورد — روز و شب او در شکار ایں شراب افتادہ است

زاہد دہدم توبہ ز روے تو، زہے روے — ہیچش ز خدا شرم و ز روے تو حیا نیست

من خراباتیم و بادہ پرست — در خرابات مغان عاشق و مست

مے کشندم چو سبو دوش بدوش — مے برندم چو قدح دست بدست

ظاہر نمے شود اثر صبح گوئیا — دود دلم دریچۂ خاور گرفتہ است

خواجہ حافظ شیراز

تاریخ شاعری کا کوئی واقعہ اس سے زیادہ افسوسناک نہیں ہوسکتا کہ خواجہ حافظ کے حالات زندگی اس قدر کم معلوم ہیں کہ تشنگان ذوق کے لب بھی تر نہیں ہوسکتے اس پایہ کا شاعر یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کثرت اور تفصیل سے اس کی سوانح عمریاں لکھی جاتیں کہ اس کی تصویر کا ایک ایک خد و خال آنکھوں کے سامنے آجاتا لیکن ہمارے تمام تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ان سب کو جمع کر دیا جائے، تب بھی ان کی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں ہوکر نہیں نظر آتا، جس قدر تذکرے ہیں سب ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں، اور وہی چند واقعات ہیں جن کو بہ اختلاف الفاظ سب نقل کرتے آتے ہیں، ان سب میں عبدالنبی فخر الزمانی نے اپنے تذکرہ میخانہ میں جو جہانگیر کے عہد میں ۱۰۳۶ھ میں لکھا گیا، ابتدائی حالات اوروں کی بہ نسبت اچھے بہم پہنچاتے ہیں، حبیب السیر میں جستہ جستہ کچھ واقعات ملتے ہیں، خود حافظ کے کلام میں جابجا واقعات کے اشارے ہیں، ان سب کو ترتیب دیکر اُن کی زندگی کی تصویر کھینچتا ہوں، لیکن دراصل یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ سچ یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ محض چند لکیریں ہیں،

نام و نسب خواجہ صاحب کے دادا، اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے، اتابکان شیراز کے زمانہ میں شیراز میں آئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی، خواجہ صاحب کے والد کا نام بہاء الدین تھا، انہوں نے یہاں تجارت شروع کی اور کاروبار کو اس قدر ترقی

دی کہ دولتمندوں میں اُن کا شمار ہونے لگا، بہاالدین نے جب انتقال کیا تو تین بیٹے چھوڑے
ان کو اگرچہ باپ سے بہت بڑا ترکہ ملا تھا لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ نہ تھا، چند روز میں باپ
کی کمائی سب اُڑ گئی، بیٹے پریشان ہو کر کہیں کے کہیں نکل گئے، لیکن خواجہ صاحب کمسنی
کی وجہ سے اپنی ماں کے ساتھ شیراز ہی میں رہ گئے، گھر میں فاقے ہونے لگے تو ان کی ماں
نے ان کو محلہ کے ایک آدمی کے حوالہ کر دیا کہ اپنی خدمت میں رکھے، اور کھانے پینے کی
کفالت کرے، لیکن یہ شخص بد اطوار تھا، خواجہ سن شعور کو پہنچے تو اس کی صحبت ناگوار
ہوئی، چنانچہ اس سے قطع تعلق کر کے خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا، آدھی رات سے اُٹھ کر
صبح تک خمیر گوندھتے، گھر کے پاس ہی ایک مکتب خانہ تھا، محلے کے سب لڑکے اُس
میں پڑھتے تھے، خواجہ صاحب اکثر اُدھر سے نکلتے، تو دل میں تعلیم کی تحریک پیدا ہوتی، رفتہ
رفتہ شوق اس قدر بڑھا کہ مکتب میں داخل ہو گئے، خمیر سے جو کچھ حاصل ہوتا اُس میں سے
ایک تہائی ماں کو اور ایک معلم کو دیتے، بقیہ خیرات کرتے، مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا،
معمولی سواد خوانی کی بھی لیاقت حاصل کی، اس زمانہ میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچا تھا
محلے میں ایک بزاز رہتا تھا، وہ سخن سنج اور موزون طبع تھا، اس مناسبت سے اور
ارباب ذوق بھی اُس کی دکان پر آ بیٹھتے تھے، اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے، خواجہ
صاحب پر بھی اس مجمع کا اثر ہوا، چنانچہ شاعری شروع کی، لیکن طبیعت موزون نہ تھی،
بے تکے شعر کہتے اور لوگوں کو تفریح طبع کا سامان ہات آتا، رفتہ رفتہ اُن کی لغو گوئی کی
شہرت تمام شہر میں پھیل گئی، لوگ تفریح کے لیئے اُن کو صحبتوں میں بلاتے اور
لطف اُٹھاتے، دو سال تک یہی حالت رہی لوگوں کا استہزا حد سے بڑھا تو ان کو بھی
احساس ہوا، ایک دن نہایت رنجیدہ ہوتے اور بابا کوہی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ

کر روتے، رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے، نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب امیر علیہ السلام ہیں، صبح کو اُٹھے تو یہ غزل لکھی،

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند … وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

شہر میں آئے تو لوگوں نے حسب معمول شعر پڑھنے کی فرمایش کی، اُنہوں نے وہی غزل پڑھی، سب کو حیرت ہوئی اور سمجھے کہ کسی سے یہ غزل لکھوالی ہے، امتحان کیلئے طرح دی، اُنہوں نے طرح میں بھی عمدہ غزل لکھی، اُسی وقت گھر گھر چرچا پھیل گیا،

یہ تمام واقعات عبد النبی نے میخانہ میں لکھے ہیں، اس میں اگرچہ خوش اعتقادی اور وہم پرستی نے بعض باتیں بڑھا دی ہیں، یا اصل واقعات کی صورت بدل دی ہے تاہم بہت کچھ اصلی واقعات بھی ہیں،

خواجہ صاحب کے کمالات اور شاعری کا چرچا عام ہوا، دور دور سے سلاطین اور امرانے اُن کے بلانے کے لئے خطوط بھیجے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں شیراز میں متعدد حکومتیں قائم ہوئیں، اور حسن اتفاق یہ کہ فرمان روا عموماً خود صاحب علم و فضل اور علما اور شعرا کے نہایت قدردان تھے،

غازان خان (چنگیز خاں کا پوتا)، کے زمانہ میں غازان خاں کی طرف سے محمد شاہ الجو، فارس اور شیراز کا حکمران مقرر ہو کر آیا تھا، اس کے خاندان میں سے شاہ ابواسحاق خواجہ حافظ کے زمانہ میں تھا، وہ نہایت قابل اور فاضل تھا، خود شاعر اور شعرا کا مربی اور قدردان تھا، اس کے ساتھ نہایت عیش پرور اور لہو لعب کا دلدادہ تھا، اس بنا پر اگرچہ ملکی انتظامات بے اصول تھے، لیکن گھر گھر عیش و نشاط کے چرچے تھے، اور شیراز باغ ارم

بن گیا تھا، خواجہ حافظ کی مستانہ غزلوں میں اس دور کا اثر شامل ہے،

شاہ ابواسحاق کی عیش پسندی حد سے بڑھ گئی تو ۷۵۴ھ میں محمد مظفر نے اس پر لشکر کشی کی، فوجیں شہر پناہ کے دامن میں آگئیں، لیکن ابواسحاق کو کوئی شخص خبر نہیں کرسکتا تھا، امین الدین نے کہ مقرب خاص تھا، ابواسحاق سے کہا کہ جوش بہار نے شہر کو چمنستان بنا دیا ہے، حضور ذرا بالاخانہ پر چلکر سیر فرمائیں، ابواسحاق نے بالاخانہ پر چڑھ کر دیکھا تو چاروں طرف فوجیں پھیلی ہوئی ہیں، پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ شاہ مظفر کا لشکر ہے مسکرا کر کہا عجب احمق ہے، اس بہار میں یوں اوقات خراب کرتا ہے یہ شعر پڑھ کر نیچے اُتر آیا،

بیا تا یک امشب تماشا کنیم ۔۔۔ چو فردا شود فکر فردا کنیم

غرض مظفر نے شیراز فتح کر لیا، اور شاہ ابواسحاق قتل کر دیا گیا، خواجہ صاحب کو سخت رنج ہوا، چنانچہ ایک قطعہ لکھا جس میں اس عہد کے تمام ارباب کمال کا تذکرہ کیا،

بعہد سلطنت شاہ شیخ ابواسحاق ۔۔۔ بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

نخست بادشہے ہمچو او ولایت بخش ۔۔۔ کہ گوئے فضل ربود و داد عدل و بخشش و داد

دوم بقیہ ابدال شیخ امین الدین ۔۔۔ کہ بود داخل اقطاب و مجمع اوتاد

سوم چو قاضی فاضل عضد کہ در تصنیف ۔۔۔ بنائے شرح مواقف بنام شاہ نہاد

دگر کریم چو حاجی قوام دریادل ۔۔۔ کہ او بہ جود چو حاتم، ہمے صلا در داد

نظیر خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند ۔۔۔ خدائے عزوجل جملہ را بیامرزاد

شاہ ابواسحاق کے مرنے کا صدمہ خواجہ صاحب کو مدت تک رہا، غزلوں میں بھی بے اختیار ابواسحاق کا نام زبان پر آجاتا ہے،

راستی خاتم فیروزۂ بواسحاقی   خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

ابواسحاق کے بعد محمد بن مظفر مبارز الدین، شیراز و فارس کا حکمران ہوا، وہ اصل میں خراسان کا باشندہ تھا، جس زمانہ میں سلطان ابوسعید نے وفات پائی اور طوائف الملوکی شروع ہوئی تو اس نے ۷۱۳ھ میں فوجیں فراہم کرکے آس پاس کے مواضع پر حملہ شروع کیا، سب سے پہلے یزد پر قبضہ کیا، رفتہ رفتہ اس کے حدود حکومت نہایت وسیع ہو گئے،

محمد بن مظفر نہایت متقشف تھا، تخت نشین ہونے کے ساتھ ہر جگہ محتسب مقرر کئے اور تمام میخانے بند کرا دیئے، تذکرۂ تقی الدین حسینی میں لکھا ہے کہ خواجہ حافظ نے اسی واقعہ پر یہ غزل لکھی ہے،

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلریز است	بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است
در آستین مرقع، پیالہ پنہاں کن	کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است
ز رنگ، بادہ بشوئید، خرقہا از اشک	کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

خواجہ صاحب کے دیوان میں ایک غزل ہے جو شراب خانوں کے بند ہونیکا نہایت پُر اثر مرثیہ ہے،

بود آیا کہ در میکدہ ہا بکشایند؟	گرہ از کار فروبستہ، ما بکشایند
گیسو چنگ ببرید بمرگ مے ناب	تا ہمہ مغبچہ ہا زلف دوتا بکشایند
نامۂ تعزیت دختر رز بنویسید	تا حریفان ہمہ خون از مژہ ہا بکشایند
در میخانہ ببستند خدایا مپسند	کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند
اگر از بہر دل زاہد خود بین بستند	دل قوی دار کہ از بہر خدا بکشایند

یہ غزل اسی زمانہ کی ہے،

امیر مبارز الدین کا بیٹا شاہ شجاع جس کا ذکر آگے آتا ہے اُس نے بھی اس موقع پر ایک رباعی لکھی اور خوب لکھی،

در مجلس دہر ساز مستی پست است　　نہ چنگ بہ قانون و نہ دف بر دست است
رندان ہمہ ترک مے پرستی کردند　　جز محتسب شہر کہ بے مے مست است

امیر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع فرمان روا ہوا، وہ اس سلسلہ کا سرتاج اور علم و فن کا پشت و پناہ تھا، وہ علم و فن کی گود میں پلا تھا، سات برس کے سن میں تعلیم شروع کی، نو برس میں قرآن مجید حفظ کیا، قاضی عضد سے شرح مفصل وغیرہ پڑھی،
حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کے سننے میں عربی کے چھ سات شعر یاد ہو جاتے تھے، عربی اور فارسی میں اس کے مکاتبات اہل ادب میں مقبول عام ہیں، علم و فضل کی قدردانی کی وجہ سے اس کا دربار علما و فضلا کا قبلہ حاجات تھا، شعر بھی کہتا تھا، تقی الدین حسینی نے اپنے تذکرہ میں بہت سے اشعار لکھے ہیں، ایک رباعی یہ ہے،

احوال بدم ز خلق پنہان مے کن　　دشوار جہان بر دلم آسان مے کن
امروز خوشم بدار و فردا با من　　انچہ از کرم تو مے سزد آں مے کن

معلوم ہوتا ہے کہ شجاع سے پہلے میخانوں کی جو روک ٹوک تھی شاہ شجاع نے آزادی تجارت کے لحاظ سے اُٹھا دی، خواجہ صاحب کے دیوان میں ایک غزل ہے وہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

غزل یہ ہے،

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش　　کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش
شد آں کہ اہل نظر بر کنارہ مے رفتند　　ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش

به بانگ چنگ بگوییم آں حکایتہا | کہ از شنیدن آں دیگ سینہ میسزد جوش
رموزِ مملکت خویش خسروان دانند | گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کی آزادپسندی نے میخواروں کو بہت آزاد کردیا تھا، اس بنا پر خواجہ صاحب اس کے بہت ممنون ہیں، اور جو غزلیں شاہ شجاع کی مدح میں لکھی ہیں، سب میں اس کا بڑے جوش سے تذکرہ کیا ہے،

قسم بہ حشمت و جاہ و جلال شاہ شجاع | کہ نیست باکم از بہر مال وجاہ و نزاع
بہ بین کہ رقص کنان مے رود بہ نالۂ چنگ | کسے کہ اذن نمے داد استماع سماع

ایک اور غزل میں کہتے ہیں،

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر | جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد مناع
عمر خسرو طلب ار نفع جہاں مے طلبی | کہ وجودیست عطا بخش وکریمی نفاع
مظہر لطف ازل روشنی چشم امل | جامع علم و عمل جان جہان شاہ شجاع

خواجہ صاحب نے اگرچہ جابجا اپنے اشعار میں شاہ شجاع کا نام مداحانہ انداز سے لیا ہے، چنانچہ ایک غزل میں فرماتے ہیں،

خیال آب خضر بست و جام کے خسرو | بہ جرعہ نوشے سلطان ابوالفوارس شد
شاہ شجاع کی کنیت

لیکن شاہ شجاع خواجہ صاحب سے صاف نہ تھا، شجاع کے عہد میں خواجہ عماد فقیہ مشہور تھے۔ شجاع ان کا نہایت معتقد تھا،

خواجہ عماد کی ایک بلّی تھی جس کو انہوں نے اس طرح تعلیم دی تھی کہ جب وہ نماز پڑھتے تو بلّی بھی نماز پڑھنے کے انداز سے جھکتی اور سر اٹھاتی، خواجہ حافظ نے اسی زمانہ میں ایک غزل لکھی،

صوفی بہ جلوہ آمد و آغاز ناز کرد　　　بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اس غزل میں ظرافت سے یا خواجہ عماد کو ریاکار سمجھ کر خواجہ صاحب نے یہ شعر لکھا[1]

اے کبک خوش خرام کہ خوش مے روی بناز　　　غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد

غالباً شجاع کی ناراضی کی ابتدا اسی شعر سے ہوئی، رفتہ رفتہ کشیدگی زیادہ بڑھتی گئی ایک دن شجاع نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ کی کوئی غزل یکساں اور ہموار نہیں ہوتی، ایک شعر میں تصوف، دوسرے میں مے پرستی، تیسرے میں شاہد بازی، اس طرح ہر شعر میں رنگ بدلتا جاتا ہے،

خواجہ صاحب نے کہا ہاں، لیکن ان سب برائیوں کے ساتھ بھی میری غزلیں میری زبان سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل جاتی ہیں، بخلاف اوروں کے کہ اُن کا قدم شہر کے دروازے سے بھی باہر نہیں نکلتا، شجاع کو اس گستاخانہ اور آزادانہ جواب پر اور زیادہ ملال ہوا،

اتفاق یہ کہ اُسی زمانہ میں خواجہ صاحب نے ایک اور غزل لکھی جس کا مقطع تھا،

گر مسلمانی ازیں است کہ حافظ دارد　　　وائے اگر در پس امروز بود فردائے

شجاع نے یہ غزل سُنی تو اس بہانہ سے کہ اس سے قیامت کا انکار یا کم از کم شبہ پایا جاتا ہے، خواجہ صاحب کو ستانا چاہا، خواجہ صاحب بہت پریشان ہوئے، حسن اتفاق یہ کہ مولانا زین الدین ابوبکر تائبادی حج کو جاتے ہوئے شیراز سے گزرے، خواجہ صاحب نے اُن سے یہ ماجرا بیان کیا، انہوں نے صلاح دی کہ مقطع کے اوپر ایک اور شعر لکھ دو جس سے مقطع دوسرے کا مقولہ بن جائے، خواجہ صاحب نے اُسی وقت کہا،

وے[2] دو بیتم چہ خوش آمد کہ سحر گہ مے گفت　　　بادف و بربط و نے، مغبچہ ترسائے

---

[1] حبیب السیر، [2] حبیب السیر،

شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ میں انتقال کیا، اس کے بعد شاہ منصور بن محمد مظفر بادشاہ ہوا،

وہ بھی بڑی شوکت وشان کا بادشاہ تھا، خواجہ صاحب نے اس کی مبارکباد میں غزل لکھی،

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید نوید فتح وظفر تا بہ مہر وماہ رسید

منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور نے شیراز پر حملہ کیا،

منصور اگرچہ نہایت دلیر اور صاحب عزم تھا، لیکن تیمور کی سطوت وعظمت کا غلغلہ تمام عالم میں پڑ چکا تھا، اس لیئے چاہا کہ شیراز سے نکل جائے، شہر پناہ کے دروازہ پر پہنچا تو ایک بڑھیا نے کہا کہ ایک مدت تک بادشاہی کر کے رعایا کو مصیبت میں چھوڑ کر کہاں بھاگے جاتے ہو! منصور وہیں سے پلٹا اور صرف دو ہزار فوج سے، تیمور پر حملہ آور ہوا اور پے در پے تیمور کی فوجوں کو شکست دیتا ہوا قلب فوج تک پہنچ گیا، تیمور پر تلوار کا وار کیا، قماری ایتاق نام ایک افسر نے بڑھ کر تلوار کو سپر پر روکا، چار دفعہ پے در پے تلوار ماری لیکن ہر دفعہ قماری ایتاق سپر ہو جاتا تھا اور تیمور کو بچا لیتا تھا، بالآخر فوجوں نے چاروں طرف سے ہجوم کر کے منصور کو قتل کر دیا، جس کا خود تیمور کو افسوس رہا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ آج تک معرکوں میں کسی کو منصور کا ہمسر نہیں دیکھا،

تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا کہ میں نے تمام عالم کو اس لیئے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو کہ میرا وطن ہے آباد کروں، تم ان کو ایک تل کے عوض میں دے ڈالتے ہو،

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے کہا انہی فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر وفاقہ تک نوبت پہنچی ہے،

خواجہ صاحب کی غزلیں اب چار دانگ عالم میں پھیل گئیں، چنانچہ خود کہتے ہیں،

بہ شعر حافظ شیراز مے گویند دمے رقصند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

اس زمانہ میں جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کے کلام سے لطف اُٹھائیں، چنانچہ عراق، عرب ہندوستان، ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے بغداد کا فرمان روا سلطان احمد بن اویس تھا جو تمام کمالات کا مجموعہ تھا مصوری، زرنگاری، کمان سازی، خاتم بندی وغیرہ ان تمام فنون میں بڑے بڑے صناع اس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے، موسیقی میں یہ کمال تھا کہ خواجہ عبد القادر نے اس کی شاگردی اختیار کی اس فن میں اس کی متعدد تصنیفات ہیں، جو مدت تک گویوں کا دستور العمل رہیں، ان باتوں کیساتھ سخن سنج اور شاعر تھا[1] خواجہ صاحب کو اُس نے بار بار بلایا، خواجہ صاحب بھی للچائے، چنانچہ بعض غزلوں میں اس کے اشارے بھی ہیں لیکن پھر بھی رکنا باد کی خاک، دامن نہیں چھوڑتی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں،

نمے دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم باد مصلّے و آب رکنا باد

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر سلطان احمد کو بھیجی[2]،

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان
احمد شیخ اویس حسن ایلخانی

خان بن خان شہنشاہ شہنشاہ نژاد
آں کہ مے زیبد اگر جان جہانش خوانی

از گل فارسیم غنچۂ عیشے نہ شگفت
حبذا دجلۂ بغداد و مے ریحانی

بر شکن کاکل ترکانہ کہ در طالع تست
دولت خسروی و منصب چنگیز خانی

اگرچہ خواجہ صاحب، بغداد جانہ سکے لیکن شوق کا کانٹا ہمیشہ دل میں کھٹکتا رہا، چنانچہ جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

[1] دولت شاہ، [2] دولت شاہ،

رہ نہ بُردیم بہ مقصود خود اندر شیراز   خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد کند

دکن میں سلاطین بہمینہ کا دور تھا، اور سلطان شاہ محمود بہمنی مسند آرا تھا، وہ نہایت قابل اور صاحب کمال تھا، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت اور روانی کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا، عام حکم تھا کہ عرب و عجم سے جو شاعر آئے اس کو پہلے قصیدہ پر ایک ہزار ٹنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے، انعام میں دیئے جائیں،

اس کی قدر دانیوں کا شہرہ سُنکر خواجہ صاحب کو دکن کے سفر کا خیال ہوا، لیکن خیال ہی خیال تھا، یہ خبر میر فضل اللہ کو پہنچی جو محمود کے دربار میں صدارت کے منصب پر ممتاز تھے، اُنھوں نے زادراہ بھیجکر طلبی کا خط لکھا، خواجہ صاحب نے اُس رُپئے میں سے کچھ بھانجوں کی ضروریات میں صرف کئے، کچھ ادائے قرض میں صرف ہوا، جو باقی رہ گیا اس سے زادراہ سفر کا سامان کر کے شیراز سے روانہ ہوئے، مقام لار میں پہنچے تو وہاں ایک دوست سے ملاقات ہوئی، جن کا مال اور اسباب حال ہی میں لُٹ گیا تھا، خواجہ صاحب نے جو کچھ پاس تھا اُن کے حوالہ کر دیا اور آپ خالی ہات رہ گئے، اتفاق یہ کہ خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی جو مشہور تاجر تھے، ہندوستان آرہے تھے، اُن کو یہ حال معلوم ہوا تو خواجہ صاحب کے مصارف کے کفیل ہوئے، لیکن سوداگروں سے ایک نازک مزاج شاعر کی نازبرداریاں کہاں انجام پاسکتی ہیں، خواجہ صاحب کو رنج ہوا تاہم صبر کیا، اور محمود شاہی جہاز پر جو دکن سے ہرمز کے بندرگاہ میں آیا تھا، اور ہندوستان کو واپس جارہا تھا، سوار ہوئے، سوء اتفاق یہ کہ جہاز نے لنگر بھی نہیں اُٹھایا تھا کہ ہوا کا طوفان اُٹھا، خواجہ صاحب فوراً جہاز سے اُتر آئے اور یہ غزل لکھ کر فضل اللہ کو بھیجی،

دمے باغم بسر بُردن جہاں یکسر نمے ارزد   بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمے ارزد

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج است — کلاہ دلکش است اما بہ درد سر نمے ارزد

بکوئے میفروشانش بجامے در نمی گیرند — زہے سجادۂ تقوے کہ یک ساغر نمے ارزد

بس آسان مے نمود اول غم دریا بہ بوے دُر — غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمے ارزد

فضل اللہ نے غزل سلطان محمود بہمنی کی خدمت میں پیش کی اور تمام ماجرا بیان کیا، سلطان نے ملا محمد قاسم مشہدی کو جو دربار کے فضلاء میں سے تھے، ایک ہزار ٹنکہ طلا دیا کہ ہندوستان کے عمدہ مصنوعات خرید کر کے لیجائیں اور خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کریں [1]،

سلطان غیاث الدین بن سلطان سکندر فرمانروائے بنگالہ نے بھی جو ۷۶۸ھ میں تخت نشین ہوا تھا، خواجہ صاحب کے کلام سے مستفید ہونا چاہا، چنانچہ طرح کا یہ مصرع بھیجا،

ع ساقی حدیث سرو و گل و لالہ مے رود

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر بھیجی،

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ مے رود — وین بحث با ثلاثۂ غسالہ مے رود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ مے رود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین — غافل مشو کہ کار تو از نالہ مے رود

خواجہ صاحب نے ۷۹۳ھ میں وفات پائی، خاک مصلّے تاریخ ہے جس میں ایک عدد کی کمی ہے۔

مصلّے ان کا محبوب مقام تھا، اس لئے دفن بھی یہیں ہوئے، سلطان بابر بہادر کے زمانہ میں محمد معمائی نے جو صدارت کی خدمت پر ممتاز تھا، خواجہ صاحب کا مقبرہ بصرف کثیر تیار کرایا جو اب تک قائم ہے، ان کے نام کی مناسبت سے اس جگہ کا نام حافظیہ ہوگیا ہے،

[1] یہ پورا قصہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

ہفتہ میں ایک خاص دن مقرر ہے لوگ زیارت کو وہاں جاتے ہیں، وہیں دن بسر کرتے ہیں، کھانے پکاتے ہیں، چاء پیتے ہیں، کہیں کہیں شراب کا دور بھی چلتا ہے، کوئی رنگین مزاج خواجہ صاحب کے نام کا حصہ خاک پر گرا دیتا ہے، خواجہ صاحب نے پان سو برس پہلے کہہ دیا تھا،

بر سر تربت ما چوں گذرے ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

آل و اولاد خواجہ صاحب کی آزادہ مزاجی اور رندی سے قیاس ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے کھیڑوں سے آزاد ہوں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی تھی، صاحبزادہ کا نام **شاہ نعمان** تھا، وہ ہندوستان میں آئے اور یہیں بمقام **برہان پور** وفات کی، اُن کی قبر قلعہ اسیر کے متصل ہے[1]

دیوان میں ایک قطعہ ہے،

صبلاح جمعہ بدو سادس ربیع اول
کہ گشت فرقت آں مہ بگشتیم حاصل

بہ سال ہفتصد و شصت و چہار از ہجرت
چو آب حل بشدم ایں دقیقۂ مشکل

غالباً یہ قطعہ بیوی کی وفات میں لکھا ہے، ایک اور قطعہ ہے۔

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند
چہ دید اندر خم ایں طاق رنگین

بجائے لوح سیمین در کنارش
فلک بر سر نہادہ لوح سنگین

اگرچہ ممکن ہے کہ یہ قطعہ کسی اور جواں مرگ کی شان میں ہو لیکن زیادہ قیاس یہی ہے کہ خود انہی کا کوئی فرزند تھا جو آغاز عمر میں گزر گیا تھا،

خواجہ صاحب کی تحصیل علم اور اُن کے مبلغ کا حال تذکرہ نویسوں نے مطلق نہیں لکھا، میخانہ سے جس کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے، صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ محلہ میں جو مکتب تھا

[1] خزانۂ عامرہ بحوالہ مرآۃ الصفا

اس میں تعلیم پائی تھی، لیکن کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے علوم درسیہ کی تحصیل مستعدانہ کی تھی، اکثر غزلوں میں عربی کے مصرعے جس برجستگی سے لاتے ہیں اس سے اُن کی عربیت کا اندازہ ہوسکتا ہے،

بعض غزلوں میں متعدد شعر، خالص عربی میں ہیں اور سلاست و فصاحت میں جواب نہیں رکھتے،

الا اے ساربان محمل دوست | الی رکبانکم طال اشتیاقی
درونم خون شد از نادیدن یار | الا نفیا لایام الفراق
بیا ساقی بدہ رطل گرانم | سقاك الله من کاس دهاق
نهانی الشیب من وصل العذاری | سوی تقبیل خد و اعتناق
سلام الله من کر اللیالی | علی ملك المكارم والمعالی
نحبك راحتی فی کل حین | و ذکرك مونسی فی کل حال
سبت سلمی بصدغیها فوادی | وروحی کل یوم لی تنادی
گر تیغ بارد در کوے آں ماہ | گردن نہادیم الحکم للہ
الصبر مر و العمر فان | یالیت شعری حتام القاہ

جا بجا عربی کے جملے اس خوبصورتی سے پیوند کرتے ہیں کہ گویا انگوٹھی پر نگین جڑ دیا ہے،

چو ہست آب حیاتت بدست، تشنہ میر | فلا تمت و من الماء کل شی حی
بخیل، بوے خدا نشنود، بیا حافظ | پیالہ گیر و سخن ورز و الضمان علی

قرآن مجید اور تفسیر کے ساتھ اُن کو خاص لگاؤ تھا، دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ تفسیر کشاف پر حاشیہ بھی لکھا ہے، خود فرماتے ہیں،

زحافظان جہان کس چو بندہ جمع نکرد | لطائف حکما با کتاب قرآنی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب قرآن مجید کی تفسیر میں معقول کو منقول سے تطبیق دیتے تھے، فن قرات میں کمال تھا، اس کے ساتھ خوش آواز تھے، معمول تھا کہ ہمیشہ جمعہ کی رات کو مسجد کے مقصورہ میں تمام رات خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے تھے[1]

قرآن مجید حفظ یاد تھا اور اس مناسبت سے حافظ تخلص رکھا تھا، قرآن دانی پران کو ناز تھا، چنانچہ اشعار میں جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ | بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ | انچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

تجرد اور آزادی

عام تذکروں کا بیان ہے کہ خواجہ صاحب دنیاوی تعلقات سے آزاد تھے اور سلاطین و امرا سے بے نیاز رہتے تھے، لیکن خود ان کے کلام سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، ان کے زمانہ میں شیراز کے جو جو فرمان روا گذرے، سب کی مدح میں اُنکے قصائد موجود ہیں، اور اُسی شان کے ہیں جو عام مدح گویوں کا انداز ہے، شاہ شجاع کی مدح میں نونیہ قصیدہ ہے، جس میں لکھتے ہیں،

دارائے دہر، شاہ شجاع، آفتاب ملک | خاقان کامگار و شہنشاہ نوجوان

حکمش روان چو باد بر اطراف بحر و بر | مہرش روان چو روح در اعضائے انس و جان

بے طلعت تو جان نہ گراید بہ کالبد | بے نعمت تو مغز نہ بندد در استخوان

سلطان ابو اسحاق کی مدح میں بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

---

[1] ہفت اقلیم امین رازی،

سپیدہ دم کہ صبا بوے بوستان گیرد
چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جنان گیرد

مدح میں لکھتے ہیں،

جمال چہرۂ اسلام شیخ بو اسحاق
کہ ملک در قدمش زیب بوستان گیرد

سلطان محمود کی مدح مثنوی میں لکھی ہے جس کا ذکر آگے آئیگا، منصور کے وزرا میں سے ایک بد ہمت نے راے دی تھی کہ علماء و فضلا کے وظیفے جن کی تعداد ۷۰ تومان تھی بند کر دیئے جائیں، منصور نے نہ مانا، اس پر خواجہ صاحب نے قصیدہ لکھا[1]،

جوز اسحر نہاد حمائل برابرم
یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

منصور بن محمد غازی است حرز من
وزایں خجستہ نام براعدا مظفرم

اے شاہ شیر گیر چہ گردد، اگر شود
در سایۂ تو ملک فراغت میسرم

جا بجا خود اُن کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین اور امرا کے نام مدحیں لکھ کر بھیجیں کہ صلے ہات آئے، چنانچہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

شاہ ہرموزم ندید و بے سخن صد لطف کرد
شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد

کار شاہان این چنین باشد تو اے حافظ مرنج
داور روزی رسان توفیق و نصرت شان دہاد

ایک اور قطعہ میں لکھتے ہیں،

خسروا! دادگرا! شیر دلا! بحر کف
اے کمال تو بہ انواع ہنر ارزانی

در دو سال انچہ بیند وختم از شاہ و وزیر
ہمہ بربود بیک دم فلک چوگانی

غرض یہ بالکل غلط ہے کہ خواجہ صاحب ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تھے، اور کسب معاش کی کچھ فکر نہ کرتے تھے البتہ فرق یہ ہے کہ اُن کے تمام معاصرین بلکہ پیشبرد نہایت

---

[1] خزانۂ عامرہ بحوالہ مرأۃ الصفا،

ذلیل اور کمینہ طریقوں سے کام لیتے تھے انوری، ظہیر فاریابی، سلمان ساوجی کس پایہ کے لوگ تھے لیکن سب کا یہ حال تھا کہ کسی کی مدح لکھی اور اس نے صلہ کم دیا یا دیر لگائی تو ہجو شروع کر دیتے تھے اور یہاں تک نوبت پہنچاتے تھے کہ تہذیب و شایستگی آنکھیں بند کر لیتی تھی، ظہیر وغیرہ کے کلام میں سینکڑوں قطعے اور قصائد ہیں، جن میں اس درجہ کا گدایانہ ابرام ہے کہ ان کو دیکھ کر شرم آتی ہے، خواجہ صاحب اس سفلہ پن سے بری ہیں، وہ مدح لکھتے ہیں، صلہ ملا تو بہتر ورنہ یہ کہہ کے چپ ہو جاتے ہیں کہ تقدیر میں نہ تھا، کبھی کبھی ہلکا سا تقاضا بھی کرتے ہیں، لیکن پیرایہ نہایت لطیف ہوتا ہے، ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

بہ سمع خواجہ رسان اے رفیق وقت شناس ۔۔۔ بہ خلوتے کہ دراں اجنبی صبا باشد

لطیفۂ بہ میان آر و خوش بخنداں‌اش ۔۔۔ بہ نکتۂ کہ دلش را دراں رضا باشد

پس آنگہے زکرم ایں قدر بپرس بہ لطف ۔۔۔ کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

ایک اور قطعہ میں کس لطف سے کنایہ کیا ہے،

دوش در خواب چناں دید خیالم کہ سحر ۔۔۔ گذر افتاد بر اصطبل شہم پنہانی،

بستہ بر آخور او استر من جوے خورد ۔۔۔ توبرہ افشاند و بمن گفت مرا میدانی

ہیچ تعبیر نہ دانمش ایں خواب کہ چیست ۔۔۔ تو بفرمائے کہ در فہم نداری ثانی

یعنی میں نے کل خواب دیکھا کہ میرا گذر شاہی اصطبل خانے کی طرف ہوا، وہاں میرا خچر جو کھا رہا تھا، مجھ کو دیکھ کر اس نے توبڑہ کا رخ میری طرف کر کے جھاڑا، اور کہا کہ کیوں مجھ کو پہچانتے ہو، اس خواب کی مجھ کو کچھ تعبیر نہیں معلوم ہوتی، آپ بڑے نکتہ فہم ہیں، آپ ہی بتائیں کہ اس کی تعبیر کیا ہے، مطلب یہ کہ گھوڑے کے دانے چارے کا سامان کر دیجئے،

معاشرت ان کے اشعار اور جستہ جستہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سادگی اور آزادی

سے بسر کرتے تھے، حافظ قرآن تھے، قرآن مجید کے نکات اور حقایق پر درس دیتے تھے، لیکن باایں ہمہ اظہار تقدس سے نہایت نفرت رکھتے تھے، صاف دل بے تکلف تھے، جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا، کوئی برائی کرتے تو ریاکاری کے پردے میں چھپا کر نہ کرتے، رکناباد جو ایک چشمہ ہے، شیراز کی مشہور سیرگاہ ہے، اب تو محض ذرا سی نہر رہ گئی ہے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں وسیع چشمہ ہوگا، اس کے کنارے بیٹھ کر عالم آب کا لطف اٹھاتے تھے، دوست احباب جمع ہوتے، ہر قسم کی صحبتیں رہتیں، اکثر اشعار میں مزے لے لے کر اس کا ذکر کرتے ہیں،

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکناباد و گلگشت مصلا را

رکناباد کے منبع کا نام اللہ اکبر ہے اس کا بھی ذکر جا بجا کرتے ہیں،

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جاے اوست
تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

جو ارباب کرم ان سے اچھا سلوک کرتے تھے، اکثر غزلوں میں اُن کا ذکر احسانمندی کے ساتھ کرتے ہیں، یہ طریقہ اُن کا خاص انداز ہے،

بخواہ جام صبوحی بیاد آصف عہد
وزیر ملک سلیمان عماد بن محمود

ع چہ غم دارم چو در عالم قوام الدین حسن دارم،

دریاے اخضر فلک و کشتی ہلال
ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

مطرب بہ پردہ سازی، شاید اگر بخواند
از طرز شعر حافظ در بزم شاہزادہ

تو بدیں نازکی و سرکشی اے شمع چگل
لایق بزمگہ خواجہ جلال الدینے

بانو گر زیں پس فلک خواری کند
باز گو در حضرت دارا ے رے

خسرو آفاق بخشش کز عطا
نامۂ حاتم زنامش گشت طے

از برائے صید دل در گردنم زنجیر زلف　　چوں کمند خسرو مالک رقاب انداختی

نصرت الدین شاہ یحییٰ آں کہ تاج آفتاب　　از سر تعظیم و قدرت در تراب انداختی

اے در رخ تو پیدا انوار بادشاہی　　در فکرت تو پنہاں صد حکمت آلہی

عمرے است بادشاہا کز مے تہی است جامم　　اینک ز بندہ دعوی، در محتسب گواہی

انصاف پسندی خواجہ صاحب اگرچہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ اُن کے تمام ہمعصر شعرا غزل گوئی میں اُن کے سامنے ہیچ تھے، تاہم وہ سب کو نہایت ادب سے یاد کرتے ہیں، بلکہ اپنے آپ کو اُن کا پیرو کہتے ہیں خواجو کرمانی کی نسبت کہتے ہیں،

اُستاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما　　دارد غزل حافظ طرز و روش خواجو

فخر کے جوش میں آکر کہتے ہیں،

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلمان است　　کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

لیکن انصاف سے دیکھو تو یہ اُن کے لئے ننگ ہے، ظہیر کو غزل میں اُن سے کیا نسبت؟

اس زمانہ میں کمال خجند مشہور شاعر اور صاحب کمال تھے، خواجہ صاحب سے ان سے بہت راہ و رسم تھی وہ خواجہ صاحب کی غزلیں منگوایا کرتے اور اپنا کلام اُنکو بھیجتے، ایک دفعہ اپنی یہ غزل بھیجی،

گفت یار از غیر ما پوشان نظر گفتم بچشم　　وانگہے وز دیدہ در ماے نگر گفتم بچشم

غزل میں یہ شعر بھی تھا،

گفت اگر سر در بیابان غمم خواہی نہاد　　تشنگان را مژدۂ از ما ببر گفتم بچشم

خواجہ صاحب اس شعر پر پہنچے، تو اُن پر حالت طاری ہوئی، افاقہ کے بعد کہا کہ واقعی اس شخص کا پایہ بہت بلند ہے،[1]

[1] دولت شاہ تذکرۂ کمال خجند۔

کلام تذکرہ میخانہ میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کا دیوان صرف دو برس میں تیار ہوا لیکن یہ قطعاً غلط ہے، خلاف قیاس ہونے کے علاوہ غزلوں میں جا بجا جن لوگوں کے نام آتے ہیں اُن کے زمانوں میں برسوں کا آگا پیچھا ہے،

خواجہ صاحب کی شہرت اگرچہ صرف غزل میں ہے لیکن اُنہوں نے قصائد اور مثنویاں بھی لکھی ہیں، اور گو وہ تعداد میں کم ہیں، لیکن اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے تمام اصناف پر اُن کو قدرت حاصل تھی، عام خیال ہے کہ جو لوگ غزل اچھی لکھتے ہیں، قصیدہ اور مثنوی اچھی نہیں لکھتے، لیکن خواجہ صاحب کے قصیدے بھی کچھ کم نہیں، اور مثنوی میں تو وہ صفائی لطافت اور زور ہے کہ نظامی اور سعدی کا دھوکہ ہوتا ہے،

سر فتنہ دارد دگر روزگار	من و مستی و فتنۂ چشم یار
فریب جہان قصہ روشن است	ببین تا چہ زاید، شب آبستن است
ہماں مرحلہ است ایں بیابان دور	کہ گم شد درو لشکر سلم و تور
ہماں منزل است ایں جہان خراب	کہ دیدہ است ایوان افراسیاب
چہ خوش گفت جمشید با تاج و گنج	کہ یک جو نیرزد سرائے سپنج
مغنی کجائی بہ گلبانگ رود	بہ یاد آور آں خسروانی سرود
مغنی بزن چنگ بر ارغنون	ببر از دلم فکر دنیائے دون
چنان برکش آہنگ این داورے	کہ ناہید چنگی برقص آورے
مغنی دف و چنگ را ساز دہ	بہ یاراں خوش نغمہ آواز دہ
مغنی کجائی نوائے بزن	بہ یکتائی او دو نائے بزن
بیا ساقی ایں نکتہ بشنو ز نے	کہ یک جرعہ مے بہ ز دیہیم کے

بیا ساقی آں آب اندیشہ سوز — کہ گر شیر نوشد شود بیشہ سوز

بیا ساقی آں آتش تابناک — کہ زردشت می جویدش زیر خاک

بدہ تا بگویاد ز آواز نے — کہ جمشید کے بود و کاؤس کے

مے دہ کہ بدنام خواہم شدن — خراب مے و جام خواہم شدن

بیا ساقیا مے کہ تا دم زنیم — قلم بر سر ہر دو عالم زنیم

سبک باش و رطل گرانم بدہ — و گر فاش نتوان نہانم بدہ

کہ ایں چرخ و ایں انجم و آبنوس — بسے یاد دارد ز بہرام و طوس

بدہ ساقی آں آب افشردہ را — بیا، زندہ ساز ایں دل مردہ را

کہ ہر پارہ خشتے کہ بر منظری است — سر کیقباد سے و اسکندری است

ہر آں گل کہ در گلستانی بود — بہ عارض دلستانی بود

ہر آں شاخ سروے کہ در گلشنے است — قد دلبر و زلف سیمین تنے است

خواجہ صاحب اگرچہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی اساتذہ سے پیچھے نہیں، لیکن ان کا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے، یہ عموماً مسلم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں ان کا ہمسر نہ ہوسکا، متوسطین اور متاخرین، غزل کے بزم آرا ہیں، لیکن ان کو تسلیم ہے کہ خواجہ صاحب کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہوا،

روا است صائب اگر نیست از رہ دعوی — تتبع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی است — صائب

صائب چہ توان کرد بہ تکلیف عزیزان — ورنہ طرف خواجہ شدن بے بصری بود — "

ع، چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد، — "

سلیم معتقد نظم خواجہ حافظ باش — کہ نشہ بیش بود در شراب شیرازی — سلیم

عرفی نے کبھی غزل میں کسی استاد کا نام نہیں لیا، تاہم کہتا ہے،

عرفی

بر آں تتبع حافظ رواست چوں عرفی ۔۔۔ کہ دل بکاود و درد سخنوری داند

خواجہ صاحب کی غزل گوئی

غزل کی بنیاد سعدی نے ڈالی اور امیر خسرو اور حسن نے اس کو ترقی دی، ساتویں صدی کا چمن انہی بلبلوں کے زمزموں سے گونج رہا تھا کہ سلمان ساوجی اور خواجو کرمانی نے نغمہ سنجی شروع کی، سعدی اور خسرو کے آگے اگرچہ اُن کو فروغ نہیں ہو سکتا تھا، لیکن یہ دونوں اور اصناف سخن یعنے قصیدہ اور مثنوی میں اس قدر ممتاز اور نام آور تھے کہ اُس اثر نے غزل میں بھی کام دیا، اس کے ساتھ ان لوگوں نے غزل میں کچھ جدّتیں بھی پیدا کیں جو زمانہ کے مذاق کے موافق تھیں اس لئے اور بھی مدد ملی، اس سے بڑھ کر یہ کہ سلطنت نے بھی ساتھ دیا، سلمان بغداد کے ملک الشعرا اور خواجو ابو اسحاق فرمانروائے شیراز کے دربار میں سب سے ممتاز تھے،

اساتذہ کا تتبع

غرض خواجہ حافظ نے آنکھیں کھولیں تو سلمان اور خواجو کا رنگ ملک پر چھایا ہوا تھا خواجہ صاحب نے دونوں کا زمانہ پایا تھا اور اتفاق یہ کہ خواجو نے جب ۷۵۳ھ میں شیراز میں وفات پائی، تو دفن اسی مقام یعنے اللہ اکبر میں ہوئے جو حافظ کی خاص سیرگاہ تھی، اور جس کی شان میں فرماتے ہیں،

فرق است زآب خضر کہ ظلمات جائے اوست ۔۔۔ تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

خواجہ صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ع دارد سخن حافظ، طرز روش خواجو،

جو غزلیں ہم طرح ہیں اُن میں جا بجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں اور مضامین اور ترکیبیں

توکثرت سے متوارد ہیں سلمان کی غزلوں پربھی اکثر غزلیں ہیں اوراُن سے بھی اس قدر جابجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ بعض بعض غزلیں دونوں کے دیوان میں موجود ہیں، اور ایک نقطہ کا فرق نہیں، اسی بنا پر بعض تذکروں میں لکھاہے کہ کاتبوں نے حافظ خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں نہایت خلط ملط کردیا ہے،

خواجہ صاحب کے کلام کا خواجو وغیرہ سے موازنہ کرنا اگرچہ اس لحاظ سے غیر ضروری ہے کہ آج کسی کو حافظ کی ترجیح میں کلام نہیں،بلکہ خواجہ صاحب کی غزلوں کے مقابلہ میں خواجو اور سلمان کی غزلوں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، لیکن شاعری کی تاریخ کا یہ ایک ضروری باب ہے کہ شاعری کی ترقی کے تدریجی مدارج دکھائے جائیں، یہ ایک واقعہ ہے کہ سعدی، خواجو اور سلمان ہی کے خاکے ہیں، جن پر حافظ نے نقش آرائیاں کی ہیں، اس لئے اُن کے باہمی امتیاز اور تدریجی ترقی کا دکھانا شعرالعجم کا ضروری فرض ہے،

سعدی اور خسرو اور حسن تک غزل میں زیادہ تر عشق وعاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے خواجو نے دنیا کی بے ثباتی، وسعت مشرب، اور رندی ومستی پر زیادہ زور دیا، اکثر غزلیں پوری کی پوری صرف دنیا کی بے ثباتی پر ہیں مثلاً یہ غزل،

پیش صاحب نظران ملک سلیمان باد است | بلکہ آں است سلیمان کہ ز ملک آزاد است

ایں کہ گویند کہ برآب نہادہ ست جہان | مشنوا اے خواجہ! کہ چوں درنگری برباد است

یا مثلاً یہ غزل

مشو بہ ملک سلیمان ومال قارون شاد | کہ مال وملک بود در رہ حقیقت باد،

خواجہ صاحب نے بھی انہی مضامین پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے،

سلمان کا خاص مذاق، مضمون آفرینی، جدت تشبیہ اور صنائع لفظی ہے، خواجہ حافظ

بھی ان چیزوں کو لیتے ہیں لیکن یہ اُن کا خاص انداز نہیں، سعدی، خسرو اور حسن کا کلام ہمہ تن عشق سوز و گداز، بیان شوق، ناامیدی اور حسرت ہے، خواجہ صاحب سعدی کی بھی تقلید کرتے ہیں، چنانچہ اکثر غزلیں اُن کی غزلوں پر لکھی ہیں، لیکن وہ فطرتاً شگفتہ مزاج اور ولولہ خیز طبیعت رکھتے تھے، اس لئے درد و غم کے نوحے ان سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے،

خواجہ صاحب نے سعدی، خواجو، سلمان کے جواب میں جو غزلیں لکھی ہیں اُن میں سے بعض ہم اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کے فرق مراتب کا اندازہ ہو سکے،

حافظ	خواجو
دوش از مسجد سوے میخانہ آمد پیر ما	خرقہ، رہن خانہ خمار دارد پیر ما
چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما	اے ہمہ رندان مرید پیر ساغر گیر ما

خواجہ صاحب کا مطلع ہر پہلو سے خواجو کے مطلع سے بڑھا ہوا ہے، اور یہ محتاج اظہار نہیں،

حافظ	خواجو
در خرابات مغان ما نیز ہمدستان شدیم	گر شدیم از بادہ، بدنام جہان تدبیر چیست
کایں چنیں رفت ست از روز ازل تقدیر ما	ہمچنیں رفت است از روز ازل تقدیر ما

خواجہ صاحب نے خواجو ہی کے مضمون اور الفاظ کو الٹ پلٹ کر دیا ہے، اور افسوس ہے کہ کچھ بھی ترقی نہیں کی، دوسرا مصرع تو حرف حرف، خواجو ہی کا مصرع ہے، پہلا مصرع خواجو کا زیادہ برجستہ اور صاف ہے، اس کے ساتھ تدبیر اور تقدیر کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے آیا ہے، خواجہ صاحب نے یہ حسن بھی کھو دیا، خواجو کے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ

شراب نے اگر ہم کو رسوا کر دیا تو علاج کیا؟ تقدیر یوں ہی تھی، خواجہ صاحب کہتے ہیں ہم کو بھی مغنوں کا ساتھ دینا پڑا، تقدیر میں یہی لکھا تھا، خواجہ صاحب کو مضمون کے لحاظ سے بھی کچھ ترجیح نہیں،

خواجو	حافظ
مادل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم	عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است
اے بسا عاقل کہ شد دیوانہ زنجیر ما	عاقلان دیوانہ گردند از پے زنجیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجو صاحب نے یہ بات اضافہ کی کہ عاقلوں کے دیوانہ زنجیر ہونے کی وجہ ظاہر کر دی، یعنی یہ کہ زلف کی قید کس قدر پُر لطف ہے اُس کے علاوہ خواجہ صاحب کا پہلا مصرع زیادہ صاف اور ڈھلا ہوا ہے، لیکن خواجو کے مصرع میں ایک خاص نکتہ ہے جو خواجہ صاحب کے ہاں نہیں، خواجو کہتا ہے کہ میرا دیوانہ دل زنجیر زلف میں پھنس گیا، یہ وہ زنجیر ہے کہ عاقل بھی اس کے دیوانے بن گئے، جس سے اس بات کی معذرت نکلتی ہے کہ جب عقلا اس زنجیر میں پھنستے ہیں تو دیوانہ کا پھنسنا کیا تعجب ہے؟ اس کے علاوہ دیوانوں کو عموماً زنجیر میں باندھتے ہیں، اس لئے دل کا زلف میں گرفتار ہونا قدرتی بات تھی خواجہ صاحب نے دل کی دیوانگی کا کچھ ذکر نہیں کیا، اس لئے گرفتاری کی کوئی معقول وجہ نہیں، خواجو کے ہاں عاقل و دیوانہ کے لفظی تقابل نے جو لطف پیدا کیا ہے، خواجہ صاحب کے ہاں وہ بھی نہیں،

خواجو	حافظ
از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو	تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جانان خموش
گر کمان نرم زخمش سخت باشد تیر ما	رحم کن بر جان خود، پرہیز کن از تیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے کوئی ترقی نہیں دی، بلکہ اس کے لطف کو کم کر دیا، خواجو نے معشوق سے صرف اس قدر کہا تھا کہ "غافل مشو"، خواجہ صاحب "خاموش اور رحم کن، بر جان خود"، سے معشوق کو خطاب کرتے ہیں، جو آداب عشق کے بالکل خلاف ہے،

حافظ	خواجو
نسیم صبح سعادت بر آں نشان کہ تو دانی	ایا صبا خبرے کن مرا ازاں کہ تو دانی
گذر بکوے فلاں کن دراں زماں کہ تو دانی	بداں زمین گذرے کن بداں زماں کہ تو دانی
تو پیک حضرت شاہی مراد و دیدہ بر راہست	چو مرغ در طیران آئی و چون براوج رسی
بمردمے نہ بفرمان ببر ہر آں کہ تو دانی	نزدل ساز دراں آشیان کہ تو دانی
بگو کہ جان ضعیفم، زدست رفت خدارا	چناں مرو کہ غبارے بدو رسد ز گذارت
ز لعل روح فزایت ببخش ازاں کہ تو دانی	بداں طرف چو رسیدی چناں بداں کہ تو دانی
من ایں دو حرف نوشتم چناں کہ غیر ندانست	
تو ہم ز روے کرامت بخوان چناں کہ تو دانی	

دونوں نے صبا کو قاصد بنایا ہے اور اُس کو ہدایتیں کی ہیں، خواجو نے صبا کو مرغ سے اور معشوق کے گھر کو آشیانہ سے تشبیہ دیکر بدمزگی پیدا کر دی، لیکن اخیر کا شعر نہایت لطیف ہے یعنی اے صبا اس طرح آہستہ اور مؤدب جانا کہ گرد تک نہ اُٹھنے پائے اور بتانے کی کیا حاجت ہے؟ تو تو خود آداب دان ہے، جیسا مناسب سمجھنا کرنا،

خواجہ صاحب کا مطلع نہایت برجستہ ہے، صبا کے بجاے نسیم اور اس پر صبح سعادت کی قید نے لطف پیدا کر دیا ہے، خواجو کے مصرع میں زمین و زمان کا جو لفظی تناسب

تھا تکلف سے خالی نہ تھا اس لئے خواجہ صاحب نے اُس کو اُڑا دیا بداں زبین،، کے بجاے
بہ کوے فلاں،، کا کنایہ زیادہ لطیف ہے، دوسرا شعر بھی نہایت لطیف ہے، کہتے ہیں کہ تو شاہی
قاصد ہے، میں تجھ کو حکم نہیں دے سکتا البتہ مروّت اور انسانیت کے اقتضا سے توقع رکھتا ہوں،
اخیر شعر اور زیادہ پرمزہ ہے، معشوق سے کہتے ہیں کہ میں نے یہ دو سطریں اس طرح چھپا کر
لکھی ہیں کہ غیروں کو خبر نہیں ہونے پائی، تم بھی اسی طرح پڑھنا، جیسا مناسب ہو، یعنی کسی کو
خبر نہ ہونے پائے،

خواجو	حافظ
دل درین پیرزن عشوہ گر دہر مبند	مجو درستی عہد از جہان بے بنیاد
کین عروسے است کہ در عہد بسے داماد است	کہ ایں عجوزہ، عروس ہزار داماد است

مضمون وہی ہے، لیکن خواجہ صاحب کی بندش میں ذرا حُسن ہے، پہلے مصرع
میں صرف اس قدر کہنا چاہئے کہ دنیا میں دل نہ لگاؤ پھر اس کی وجہ بتانی چاہئے کہ یہ ایک
ایسی عجوزہ ہے جو ہزاروں کے نکاح میں ہے، خواجو نے پہلے ہی کہہ دیا کہ عجوزۂ دہر سے
دل نہ لگاؤ حالانکہ جب پہلے ہی عجوزہ کہہ دیا، تو اس دلیل کی ضرورت نہیں رہی کہ وہ کثیر الازواج
ہے کیونکہ بُڑھیا سے یوں بھی انسان کو محبت نہیں ہوتی، خواجہ صاحب نے پہلے دنیا
کی بُرائی کو مطلق حیثیت سے بیان کیا پھر ایک ساتھ نفرت کی دو وجہیں بتائیں یعنی یہ بوڑھی
ہے اور کثیر الازواج بھی ہے،

خواجو	حافظ
منزل، ار یار قرین است چہ دوزخ چہ بہشت	ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست
سجدہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت	ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

خواجو کے شعر کو خواجہ صاحب کے شعر پر ترجیح ہے، اوّل تو خواجو نے مطلع میں جس میں قافیہ کی پابندی ہو جاتی ہے، ایسے وسیع مضمون کو ادا کیا ہے، اس کے ساتھ دونوں عالم کی دونوں چیزیں لے لیں یعنی دوزخ اور بہشت، مسجد اور کنشت، ان سب کے علاوہ مسجد کی تنکیر اور تعمیم اور نیاز کی قید نے جو لطف پیدا کیا ہے، خواجہ صاحب کے ہاں مطلق نہیں، خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ مسجد اور گرجا دونوں عشق کے گھر ہیں اور ایک ہی چیز ہیں، خواجو دونوں کو مخالف تسلیم کر کے کہتا ہے کہ سجدۂ نیاز وہ چیز ہے کہ مخالف اور موافق ہر جگہ ادا کیا جا سکتا ہے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ سجدۂ نیاز گرجا میں بھی ادا کیا جائے تو مسجد بن جائے،

خواجو	حافظ
عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم	کے برکنم دل از رخ جانان کہ مہر او
باشیر در بدن شد و با جان بدر شود	باشیر در دل آمد و با جان بدر شود

خواجہ صاحب نے جس طرح اس مضمون کو ترقی دی ہے محتاج اظہار نہیں،

خواجو اور خواجہ صاحب کی غزلیں اکثر ہم طرح ہیں اختصار کے لحاظ سے ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں،

خواجہ صاحب نے سلمان کی اکثر غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں جن میں کہیں سلمان کی تقلید کی ہے، کہیں سلمان کے مضمون کو لے کر زیادہ دلکش پیرایے میں ادا کیا ہے کہیں سلمان کے آئینہ کو زیادہ جلا دیدی ہے،

سلمان	حافظ
آوازۂ جمالت تا در جہان فتادہ	عید است و موسم گل ساقی بیار بادہ
خلقے بجستجویت سر در جہان نہادہ	ہنگام گل کہ دیدست بے قدح نہادہ

دونوں مطلع بالکل الگ الگ ہیں انمیں کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا،

سودائے زُہد خشکم بر باد دادہ حاصل — گل رفت اے حریفان غافل چرا نشینید
مطرب بزن ترانہ، ساقی بیار بادہ — بے بانگ رود وچنگے بے یار وجام وبادہ

سلمان کا دوسرا مصرع نہایت برجستہ اور مستانہ ہے،

بائیم لبتہ دل را در لعل دلکشایت — زین زہد و پارسائی بگرفت خاطر من
آں لب بہ خندہ بکشا تا دل شود کشادہ — ساقی پیالہ دہ تا دل شود کشادہ

صنعت اضداد کا دونوں نے لحاظ رکھا ہے، لیکن سلمان کے الفاظ زیادہ صاف ہیں یعنے بستن وکشادن، گرفتن اور کشادن میں بھی گو یہی صنعت ہے، لیکن گرفتن کے یہ اصلی معنی نہیں ہیں بلکہ محاورہ نے یہ معنی پیدا کیے ہیں، اس کے علاوہ دل کے کھلنے کی توجیہ سلمان کے ہاں لفظاً اور معنیً دونوں لحاظ سے زیادہ روشن ہے، یعنے تو لب کھول تو ہمارا دل بھی کھلے، کیونکہ ہمارا دل تیرے لبوں میں بندھا ہوا ہے، پیالہ سے دل کھلنے میں یہ بات نہیں،

سلمان — حافظ

سودائیان زلفت گرد تو حلقہ بستہ — در مجلس صبوحی، دانی ؟ چہ خوش نماید
شوریدگان مویت در یکدگر فتادہ — عکس عذار ساقی بر جام مے فتادہ

مضمون کے لحاظ سے دونوں شعر الگ الگ ہیں البتہ قافیہ مشترک ہے اور سلمان کے ہاں اچھا بندھا ہے، یوں بھی سلمان کا شعر اچھا ہے،

شیخ سعدی کے جواب میں بھی گو اکثر غزلیں ہیں لیکن درحقیقت دونوں کے راستے الگ الگ ہیں، اس لئے ان میں موازنہ نہیں ہوسکتا، تاہم متعدد مضامین خواجہ صاحب نے شیخ سعدی سے لئے ہیں لیکن ان کے اسلوب کو اس طرح بدل دیا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ

بہ مدو تی انہی تغزلوں سے بنے ہیں، مثالیں جدت اسلوب کے عنوان میں آئیں گی،

خواجہ صاحب کی خصوصیات تم نے دیکھا! خواجہ صاحب اپنے اساتذہ یا حریفوں سے طرحی غزلوں میں چنداں بلند رتبہ نہیں ہیں، اُن کی شاعری کے مہات مضامین بھی ان کا ذاتی سرمایہ نہیں، بلکہ خیام کے ابر قلم کے رشحات ہیں، بااین ہمہ اُن کی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کردیا، اس کے آگے سعدی، خسرو، خواجو، سلمان کی آوازیں بالکل پست ہوگئیں اس کا کچھ سبب ہوگا، اور وہی خواجہ صاحب کی خصوصیات شاعری ہیں۔ یہ خصوصیات اگرچہ درحقیقت ذوقی اور وجدانی ہیں جو صرف مذاق سلیم سے تعلق رکھتے ہیں تاہم جس قدر ضبط تحریر میں آسکتا ہے وہ حسب ذیل ہے،

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہوگئی ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے، ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوروں کے ہاں نکل آئے لیکن خواجہ صاحب کا کلام ع "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے،

ان میں بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جو اوروں کے کلام میں اس درجہ تک نہیں پائے جاتے، مثلاً روانی، برجستگی اور صفائی، یہ وصف سعدی اور خسرو کا بھی مابہ الامتیاز ہے لیکن یہ ایسی چیز ہے جس کے مدارج کی حد نہیں، ممکن ہے کہ ایک شعر خود نہایت رواں اور صاف وشستہ ہو، لیکن ایک اور شعر اس سے بھی بڑھ کر ہو اور اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور شعر ہو جس طرح نغمہ اور حسن کہ ان کے مدارج ترقی کی کوئی حد نہیں،

ایک اور چیز جو خواجہ صاحب کی شاعری کا نہایت نمایاں وصف ہے جوش بیان ہے، اسی طرح تنوع مضامین بھی، ان سے پہلے اس قدر نہ تھا، چنانچہ ہم ان کے کلام

کے تمام اوصاف کو الگ الگ عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں،

جوش بیان فارسی شاعری، باوجود ہزاروں گوناگون اوصاف اور خیالات کے، جوش بیان سے خالی ہے، فردوسی اور نظامی کے ہاں خاص خاص موقعوں پر جوش بیان کا پورا زور ہے، لیکن وہ اوروں کے خیالات اور واردات ہیں، خود شاعر کے حالات اور جذبات نہیں، بخلاف اس کے خواجہ حافظ کے کلام میں جو جذبات ہیں وہ خود اُن کے واردات اور حالات ہیں اس لئے اُن کو وہ اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے جوش بیان کے لئے کسی مضمون یا کسی خیال کی خصوصیت نہیں، ہر مضمون اور ہر خیال جوش کے ساتھ ظاہر کیا جا سکتا ہے، البتہ اختلاف نوعیت کی وجہ سے صورتیں بدل جاتی ہیں مثلاً شاعر جوش مسرت کا بیان کرتا ہے تو اس انداز سے کرتا ہے کہ گویا آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، قہر اور غضب کا بیان ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا مرقع اُلٹ دے گا، دنیا کی بے ثباتی کا مذکور ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالم ہیچ ہے، غصہ اور غضب کا مضمون ہے تو نظر آتا ہے کہ مُنہ سے انگارے برس رہے ہیں،

خواجہ صاحب نے سینکڑوں گوناگون خیالات ادا کئے ہیں اور جس خیال کو ادا کیا ہے اس جوش کے ساتھ کیا ہے کہ سُننے والے پر وہی اثر طاری ہوجاتا ہے جو خود خواجہ صاحب کے دل میں ہوتا ہے،

زمانہ کی بے اعتباری

اعتمادے نیست بر دور جہان	بلکہ بر گردون گردان نیز ہم
سرود مجلس جمشید گفتہ اند این بود	کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند

استقلال و ثبات قدمی

حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است	ما ہمانیم کہ بودیم وہمان خواہد بود

وجد و ذوق

در نمازم خم ابروے تو ام یاد آمد	حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

نشۂ عشق کی دلاویزی

از حدیث سخن عشق ندیدم خوشتر — یادگاری کہ دریں گنبد دوار بماند

واعظوں کی عقل اور پند کی تحقیر

بادہ خور غم مخور و پند مقلد مشنو — اعتبار سخن عام چہ خواہد بودن

معشوق کی دلفریبی

مے ترسم از خرابی ایمان کہ مے برد — محراب ابروے تو حضور نماز من

مستی کی تمنا

زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب — مارا بہ جام بادۂ گلگون خراب کن

کمال کسی پر محدود نہیں

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید — دیگران ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

ہمہ تن فنا در محبت ہونا

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم — از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

اعلان راز

داستان در پردہ مے گویم ولے — گفتہ خواہد شد بہ دستان نیز ہم

محتسب داند کہ حافظ مے خورد — آصف ملک سلیمان نیز ہم

ظاہر و باطن یکساں ہونا

رنگ و تزویر پیش ما نبود — شیر سرخیم و افعی سیہیم

معشوق کی روح افزائی

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر — تا سحر گہ ز کنار تو جوان برخیزیم

جود و کرم کی ترغیب

اے نور چشم من سخنے ہست گوش کن — تا ساغرت پر است بنوشان و نوش کن

غریبوں کے ستانے کا انجام

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات — با دُرد کشان ہر کہ در افتاد بر افتاد

سوز دل کا اثر

سوز آہ سینۂ سوزاں من — سوخت ایں افسردگان خام را

جوش بیان کا اصلی موقع وہاں آتا ہے جہاں کسی خاص جذبہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے مثلاً رنج و غم فخر و ناز، غیظ و غضب، عشق و محبت،

خواجہ صاحب پر رندی اور سرمستی کا جذبہ غالب تھا، ان کے تمام کلام میں یہ جذبہ اس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی، اس کے اندازہ کرنے کے لئے پہلے ایک رند سرمست کی حالت کا تصور باندھو، کہ جب وہ مستی کے جوش و خروش میں ہوتا ہے، تو اس کے دل میں کیا کیا خیالات آتے

ہیں، وہ مزے میں آکر ہنکارتا ہے کہ مجھ کو تام و ننگ کی کچھ پرواہ نہیں ساقی پیالہ پر پیالہ دیئے جا، اور کسی سے نہ ڈر، زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا کیا گوناگون عالم نظر آتے ہیں، مطرب سے کہہ دو یہ ترانہ گائے کہ تمام دنیا پر میری حکومت ہے، کل خاک میں جانا ہی ہے آج کیوں نہ عالم میں غلغلہ ڈال دوں تم مجھے حقیر سمجھتے ہو شراب خانہ میں آؤ تو تم کو نظر آئے کہ میری کیا شان ہے؟ میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے جمشید کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا، میں شراب آج سے نہیں پیتا، مدت سے آسمان اس غلغلہ سے گونج رہا ہے، صوفی اور واعظ رازدانی کی شیخیاں بگھارتے ہیں، حالانکہ جو کہتے ہیں مجھی سے سن لیا تھا، یہ عالم لطف اٹھانے کے لئے کافی نہیں، آؤ آسمان کی چھت توڑ کر ایک اور نیا عالم بنائیں، خواجہ صاحب ان خیالات کو اسی جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں جس طرح ایک سرمست کے دل میں آتے ہیں؛

ابھی یہ بحث چھوڑ دو کہ خواجہ صاحب کی شراب معرفت کی شراب ہے یا انگور کی مستی دونوں میں ہے اور یہاں صرف مستی سے غرض ہے،

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

آؤ پھول برسائیں اور شراب پیالہ میں ڈالیں
آسمان کی چھت توڑ ڈالیں اور نئی بنا ڈالیں

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقان ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

اگر عاشقوں کے مقابلہ کے لئے فوج تیار کرے، تو ہم اور ساقی دونوں ایکا کرکے اس کی جڑ اکھاڑ کر پھینکدیں

چو در دست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشان غزل خوانیم و پاکوبان سر اندازیم

رند مزے میں آکر جب گاتا ہے تو دونوں طرف ہاتھ جھٹکتا ہے، پاؤں زمین پر دے دے کر مارتا ہے، سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیتا ہے، یہ شعر بعینہ اس حالت کی تصویر ہے،

ساقی بہ نور بادہ برافروز جام ما
مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما

ما در پیاله عکس رخ یار دیده ایم — اے بیخبر ز لذت شرب مدام ما

ساقیا برخیز و در ده جام را — خاک بر سر کن غم ایام را

گرچه بدنامی است نزد عاقلاں — ما نمے خواہیم ننگ و نام را

تا ز میخانه و مے نام و نشان خواہد بود — سر ما خاک ره پیر مغاں خواہد بود

حلقهٔ پیر مغانم ز ازل در گوش است — ما ہمانیم که بودیم و ہماں خواہد بود

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواه — که زیارت گہ رنداں جہاں خواہد بود

عاقبت منزل ما وادی خاموشاں است — حالیا غلغله در گنبد افلاک انداز

حاصل کارگہ کون و مکاں اینہمه نیست[1] — باده پیش آر که اسباب جہاں اینہمه نیست

ساقی بیار باده و با مدعی بگو — انکار ما مکن که چنیں جام جم نداشت

خوش وقت رند مست که دنیا و آخرت — از دست داد و ہیچ غم بیش و کم نداشت

ما مے بہ بانگ چنگ نہ امروز مے خوریم — بس دور شد که گنبد چرخ ایں صدا شنید

سر خدا که عارف و سالک بکس نگفت — در حیرتم که باده فروش از کجا شنید

ساقی بیا که عشق ندا مے کند بلند — کاں کس که گفت قصهٔ ما ہم ز ما شنید

من ترک عشق بازی و ساغر نمے کنم — صد بار توبه کردم و دیگر نمے کنم

من رند و عاشق و آنگاه توبه — استغفر الله استغفر الله

ما زہد و نقدے کمتر شناسیم — یا جام باده یا قصه کوتاه

شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد — زدیم بر صف رنداں و ہرچه باداباد

سخن درست بگویم نمے توانم دید — که مے خورند حریفاں و من نظاره کنم

[1] یعنی کچھ ایسی کائنات نہیں،

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بین ۔۔۔ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

نہ قاضیم نہ مدرس نہ مفتیم نہ فقیہ ۔۔۔ مرا چکار کہ منع شراب خوارہ کنم

بامن خاک نشین خیز و سوے میکدہ آے ۔۔۔ تا بہ بینی کہ دراں حلقہ چہ صاحب جاہم

اے خوشا حالت آں مست کہ در پاے حریف ۔۔۔ سر و دستار نہ داند کہ کدام انداز د

خوشتر از فکر مے و جام چہ خواہد بودن ۔۔۔ چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

پیر میخانہ چہ خوش گفت معمائے دوش ۔۔۔ از خط جام کہ فرجام چہ خواہد بودن

بادہ خور غم مخور و پند مقلد مشنو ۔۔۔ اعتبار سخن عام چہ خواہد بودن

غم دنیاے دنی چند خوری بادہ بخور ۔۔۔ حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

ساقی بیا کہ شد قدح لالہ پر ز مے ۔۔۔ طامات تا بچند و خرافات تا بہ کے

شیخم بہ طنز گفت حرام است مے مخور ۔۔۔ گفتم برو کہ گوش بہر خر نے کنم

کہ برو؟ بہ سزد شاہان زمن گدا پیامے ۔۔۔ کہ بکوے مے فروشاں دو ہزار جم بہ جامے

صبح است ژالہ مے چکد از ابر بہمنے ۔۔۔ برگ صبوح سازد بزن جام یک منے

ساقی بہوش باش کہ غم در کمین ماست ۔۔۔ مطرب نگاہ دار ہمیں رہ کہ میزنی

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نشود ۔۔۔ ز زہد ہمچو توئی یا ز رندی چو منی

ما مرد زہد و توبہ و طامات نیستم ۔۔۔ باما بہ جام بادۂ صافی خطاب کن

زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب ۔۔۔ مارا بہ جام بادۂ گلگون خراب کن

یہ مضامین کہ دنیا چار دن کی چاندنی ہے، اس کے لئے جھگڑوں اور بکھیڑوں میں پڑنے سے کیا حاصل، کھاؤ پیو لطف اُٹھاؤ اور دنیا سے گزر جاؤ، سو سو طرح بندھ چکے ہیں، خیام کی تمام شاعری کی یہی کائنات ہے، لیکن خواجہ صاحب کے ہاں جو جوش

بیان پایا جاتا ہے فارسی شاعری اس سے خالی ہے،

شراب تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش　　کہ تا لیختے بیاسایم ز دنیا و ز شر و شورش

کمند صید بہرامے بیفگن جام مے بردار　　کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام ست نہ گورش
گورخر

مے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ　　ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منے　　فراغتی و کتابے و گوشۂ چمنے

من ایں مقام بہ دنیا و آخرت ندہم　　اگرچہ در پیم افتند خلق انجمنے

دنیا کی شان و شوکت، جاہ و جلال، دھوم دھام، ان کو للچانا چاہتے ہیں، لیکن اُنکے دل سے یہ صدا آتی ہے کہ تا کے؟ یہ نیرنگیاں کب تک؟ اس جھوٹے طلسم کے لئے زندگی کو کیوں آلودہ کیا جائے،

بس کن ز کبر و ناز کہ دیداست روزگار　　چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

حاصل کارگہ کون و مکان اینہمہ نیست　　بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست،

بیفشاں جرعۂ بر خاک و حال اہل شوکت بین　　کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستان دارد

گرہ بہ باد مزن گرچہ بر مراد وزد　　کہ ایں سخن بہ مثل باد با سلیمان گفت

یہ فلسفہ خواجہ صاحب پر اس قدر چھا گیا تھا کہ بوریائے فقر ان کو مسند جمشید نظر آتا تھا، وہ خود اس خیال میں مست تھے اور چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اس عالم کا لطف اُٹھائیں، وہ مناظر قدرت سے، بہار سے، آب رواں سے، سبزہ و مرغزار سے، لطف اُٹھاتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ خوش عیشی کا یہ عالم ہر شخص کو نصیب ہو سکتا ہے، اس بنا پر وہ تمام دنیا کو خوش عیشی کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں، یونان میں ایپکورس کی بھی یہی تعلیم تھی لیکن وہ فلسفی تھا اس لئے جو کچھ کہتا تھا فلسفہ کے انداز میں کہتا تھا، خواجہ صاحب شاعر تھے اور

نظری شاعر تھے اس لئے اُنھوں نے خوش عیشی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ زمین سے آسمان تک جوش مسرت سے لبریز نظر آتا ہے اور یہی شاعری کا اصلی کمال ہے،

عید است ساقیا قدحے پر شراب کن — دور فلک درنگ ندارد شتاب کن

بنوش بادہ کہ ایّام غم نخواہد ماند — چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

دمے باغم بسر بُردن جہاں یکسر نمے ارزد — بہ مے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمے ارزد

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج است — کلاہ دلکش است اما بہ دردسر نمے ارزد

غم دنیاے دنی چند خوری بادہ بخور — حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

خوشتر از فکر مے و جام چہ خواہد بودن — چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

بہار سے لطف اُٹھاتے ہیں

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد — عالم پیر دگر بارہ جوان خواہد شد

ارغوان جام عقیقی بہ سمن خواہد داد — چشم نرگس بہ شقائق نگران خواہد شد

مطربا مجلس انس است غزل خوان و سرود — چند گوئی کہ چنیں است و چنان خواہد شد

بلبل ز شاخ سرو بہ گلبانگ پہلوے — مے خواند دوش درس مقامات معنوی

مرغان باغ قافیہ سنجید و بذلہ گو — تا خواجہ مے خورد بہ غزل ہاے پہلوی

درویشم و گدا و برابر نمے کنم — پشمین کلاہ خویش بہ صد تاج خسروی

خوش فرش بوریا و گدائی و خواب امن — کیں عیش نیست درخور اورنگ خسروی

آخر الامر گل کوزہ گران خواہی شد — حالیا فکر سبو کن کہ پُر از بادہ کنی

اے کہ در کوے خرابات مقامے داری — جم وقت خودی ار دست بہ جامے داری

اے کہ با زلف و رخ یار گذاری شب و روز — فرصتت باد کہ خوش عیش دوامے داری

مے خواہ گل افشاں کن از دہر چہ مے جوئی ایں گفت سحرگہ گل بلبل تو چہ مے گوئی

مسند بہ گلستان بر شاہد و ساقی را لب گیری و رخ بوسی مے نوشی و گل بوئی

خواجہ صاحب کے اس خاص کمال (جوش بیان) کا اندازہ اس وقت اچھی طرح ہوسکتا ہے جب انہیں مضامین کے متعلق اور اساتذہ کے کلام کا موازنہ کیا جاوے نمونہ کے لئے ہم صرف چند شعروں پر اکتفا کرتے ہیں،

سلمان	حافظ
رندی و عاشقی و قلاشی	عاشق و رند و نظر بازم و میگویم فاش
ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست	تا بدانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام
دروں صافی از اہل صلاح و زہد مجوی	راز درون پردہ ز رندان مست پرس
کہ ایں نشانہ رندان دردے آشام است	کیں حال نیست صوفی عالی مقام را
مکن ملامت رندان دگر بہ بد نامی	گرچہ بد نامی است نزد عاقلان
کہ ہر چہ پیش تو ننگ است نزد ما نام است	ما نمے خواہیم ننگ و نام را
غرض از کعبہ و بت خانہ توئی سلمان را	جلوہ بر من مفروش اے ملک الحاج کہ تو
چکنم خانہ بے خانہ خدا باید رفت	خانہ مے بینی و من خانہ خدا مے بینم
من از آں روز کہ در بند توام آزادم	فاش مے گویم و از گفتہ خود دلشادم
بادشاہم چو بدست تو اسیر افتادم	بندۂ عشقم و از ہر دو جہان آزادم
اے گنج نوشدارو در خستگان نظر کن	یارب ایں با کہ توان گفت کہ آں نوشین لب
مرہم بدست و مارا مجروح مے گذاری	کشت مارا و دم عیسے مریم با اوست

بدایع الاسلوبی یعنی جدت و خوبی ادا اکثر مضامین ایسے ہیں جو مدتوں سے بندھتے آتے تھے یا بندھے

نہ تھے لیکن بجائے خود معمولی مضمون تھے، جن میں کوئی دلفریبی نہ تھی خواجہ صاحب کے حسن اسلوب اور جدت ادا نے اس کو نہایت دل آویز اور لطیف کر دیا، مثلاً معشوق کی آنکھ کو سب مخمور، سرشار اور مست کہتے آئے ہیں، خواجہ صاحب اسی بات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

ہر کس کہ بدید چشم او گفت　　　　کو محتسبے کہ مست گیرد

یعنی جس نے اُس کی آنکھ دیکھی بول اُٹھا کہ کہیں محتسب نہیں کہ مست کو گرفتار کرے،

معشوق کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دینا معمولی بات ہے خواجہ صاحب اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ میزد　　　　صبا حکایت زلف تو در میان انداخت

یہ مضمون اس طرح ادا کیا ہے کہ تصویر کھینچ دی ہے، بنفشہ گویا ایک حسین اور جمیلہ ہے اس کی زلفیں نہایت خوب صورت اور گھونگر والی ہیں، وہ بڑے ناز و انداز سے بیٹھی ہوئی چوٹی میں گرہیں لگا رہی ہے، اتنے میں کہیں سے صبا آنکلی، اُس نے معشوق کی زلفوں کا ذکر چھیڑ دیا بنفشہ عین، غرور اور ناز کی حالت میں شرما کر رہ گئی،

جدت میں جدت یہ ہے کہ نتیجہ یعنے بنفشہ کا شرمندہ ہو جانا بیان نہیں کیا کہ اسکے اظہار کی ضرورت نہیں،

زاہد کی نسبت یہ خیال ظاہر کرنا مقصود تھا کہ گو وہ شراب وغیرہ استعمال نہیں کرتا تاہم چونکہ اس کی فتوحات اور نذور، ریا اور زور کے ذریعہ سے ہات آتی ہیں اس لئے وہ بھی حرام سے کم نہیں، اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز باز خواست　　　　نان حلال شیخ ز آب حرام ما
شراب

یعنی مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن شیخ کی حلال روٹی امیرے آب حرام (شراب) سے بازی لے جائے، جدت اسلوب کے ساتھ ہر لفظ ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے،

ترنم سے دکھانا ہے کہ میں اس بات کو بطور شماتت کے نہیں کہتا، بلکہ ہمدردی کے لحاظ سے مجھ کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو، قیامت کو بازخواست کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ کھوٹے کھرے کے پرکھنے کا دن ہے،

نان حلال، اور آب حرام کے مقابلہ نے علاوہ صنعت اضداد کے جو نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہے، اصل مضمون کو نہایت بلیغ کر دیا ہے، یعنی زاہد کی روٹی باوجود حلال ہونے کے، میرے آب حرام سے بازی نہ لی جائے، تو زاہد کے لئے کس قدر افسوس کا سبب ہوگا،

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوے داد   کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است

اس طرز ادا کی بلاغت پر لحاظ کرو، اول تو اس امر کا اعتراف کہ شراب گو حرام سہی لیکن مال وقف سے بہر حال اچھی ہے، خود فقیہ کی زبان سے کرایا ہے، اس کے ساتھ مست کی قید لگا دی ہے، جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فقیہ سچی بات کا اظہار یوں کا ہیکو کر تا مست تھا، اس لئے پس و پیش کا خیال نہ آیا اور جو دل میں تھا زبان سے کہہ گیا،

زاہد خدا کا تصور جو دلوں میں قائم کراتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ مجسم قہر و غضب ہے، ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتا رہتا ہے اور نہایت بے رحمانہ سزائیں دیتا ہے، لیکن اہل نظر کے نزدیک خدا سرتاپا لطف اور رحم ہے، اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

پیر دردے کش ما گرچہ ندارد زر و زور   خوش عطا بخش و خطا پوش خدائے دارد

"خدائے" کی تنکیر نے کیا لطف پیدا کیا ہے، گویا ایسا خدا بہت غیر معروف ہے زاہد وغیرہ سے اس سے مطلق شناسائی نہیں،

یہ مضمون کہ میں نے معشوق کا انتخاب ایسی دیدہ وری سے کیا کہ ہر شخص نے اس کی

داد دی، اس کو یوں ادا کرتے ہیں،

ہر کس کہ دید روے تو بوسید چشم من کارے کہ کرد دیدۂ من بے بصر نکرد

یعنی جس نے تیرا چہرہ دیکھا میری آنکھیں چوم لیں کہ کیا عمدہ انتخاب ہے، میری آنکھ

نے جو کام کیا دیکھ بھال کے کیا،

شاہد بازی کی نسبت یہ عذر خواہی کہ اور لوگ بھی تو کرتے ہیں، عام مضمون ہے سعدی

فرماتے ہیں،

گر کند میل بہ خوبان دل من خرده مگیر کین گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اسی مضمون کو خواجہ صاحب جدید اور لطیف اسلوب سے ادا کرتے ہیں،

من ارچہ عاشقم و رند و مست نامہ سیاہ ہزار شکر کہ یاران شہر بے گنہ اند

شعر کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ میں اگرچہ گنہگار اور نالایق ہوں لیکن خدا کا شکر ہے کہ

شہر میں اور لوگ پاکیزہ اخلاق ہیں، جس کی برکت سے میری شامت اعمال کا اثر اوروں پر

نہ پڑے گا، لیکن حقیقت میں یہ اوروں پر در پردہ چوٹ ہے، سعدی نے کھلے لفظوں

میں کہہ دیا، خواجہ صاحب کنایۃً ادا کرتے ہیں،

خدا کے عفو کے بھروسہ پر شراب پینے کی جرات اس پیرایہ میں دلاتے ہیں،

بیار بادہ بخور زان کہ پیر میکدہ دوش بسے حدیث غفور و رحیم و رحمٰن گفت

اس موقع پر خدا کے متعدد نام جن سے رحم اور مغفرت کا اظہار ہوتا ہے، لانا کس قدر

بلاغت ہے،

دنیا کی بے ثباتی کو اس انداز میں ادا کرتے ہیں،

سرود مجلس جمشید گفتہ اند ایں بود　　　　که جام باده بیاور که جم نخواہد ماند

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا کچھ اعتبار نہیں اس لئے یہ چند روزہ زندگی عیش وعشرت

میں گذار دو کل خدا جانے کیا ہوگا، اس مضمون کے لئے کس قدر بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہے،

عیش اور کامیابی میں جمشید سب سے نامآور ہے، تاہم خود اُس کی مجلس میں یہ راگ گایا جاتا

تھا، اس سے بڑھ کر دنیا کی بے ثباتی کا کیا ثبوت ہوگا جمشید کا نام اس بے حقیقتی سے لینا

کہ القاب وخطاب ایک طرف پورا نام بھی نہیں، اس مضمون کو نہایت با اثر کر دیتا ہے،

شرم ازاں چشم سیہ بادش و مژگان دراز　　　　ہر کہ دل بردن او دید و دراں کار من است

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ جو شخص میرے اوپر اعتراض کرتا

ہے اگر معشوق کو دیکھ لیتا تو اعتراض سے باز آتا، اس کو یوں ادا کیا ہے کہ جو شخص میرے دل

باختگی پر اعتراض کرتا ہے اس کو معشوق کی آنکھ اور مژگان سے شرم نہیں آتی یعنے مجھ پر

اعتراض کرنا گویا آنکھوں کی دلربائی سے انکار کرنا ہے،

یا رب بہ کہ تواں گفت ایں نکتہ کہ در عالم　　　　رخسارہ بہ کس ننمود آں شاہد ہر جائی

اس مضمون کو کہ شاہد مطلق (خدا) کا جلوہ اگرچہ ایک ایک ذرہ میں چمکتا ہے لیکن اسکی

حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی، کس بدیع اسلوب سے ادا کیا ہے، یعنی کس قدر

تعجب ہے کہ ہر جائی بھی ہے اور آج تک کسی نے اس کو دیکھا بھی نہیں، وصالی نے اسی مضمون

کو یوں ادا کیا ہے،

اے کہ در ہیچ جانہ داری جا　　　　بو العجب ماندہ ام کہ ہر جائی

لیکن خواجہ صاحب کی طرز ادا میں لطافت کے علاوہ اسلوب بھی زیادہ معنی خیز ہے

بدیع الاسلوبی کے اچھی طرح سے سمجھ میں آنے کے لئے ہم چند مثالیں لکھتے ہیں

جن سے ظاہر ہوگا کہ ایک مضمون جو کسی اور اُستاد نے باندھا تھا خواجہ صاحب نے خوبی ادا سے اس کو کس قدر بلند رتبہ کر دیا ہے،

سعدی

تو گرچہ امیر و ما فقیریم
دل داری دوستان ثواب است

حافظ

در راہ عشق، فرق غنی و فقیر نیست
اے بادشاہ حُسن سخن با گدا بگو

سعدی

اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم
تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

حافظ

بنال بلبل اگر با منت سر یاری است
کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

شیخ صاحب کہتے ہیں کہ "بلبل اگر تو رونے پر آمادہ ہو تو میں بھی تیرا ساتھ دینے کو موجود ہوں، مجھ کو تجھ سے ہمدردی کی یہ وجہ ہے کہ تو گل پر عاشق ہے اور میرا معشوق بھی گل اندام ہے"، غرض شیخ نے ہمدردی کی وجہ معشوق کا ایک گونہ اشتراک قرار دیا ہے، لیکن یہ پہلو نزاہت اور غیرت سے ذرا ہٹا ہوا ہے، اس لئے خواجہ صاحب ہمدردی کی وجہ صرف عشق کی شرکت قرار دیتے ہیں، معشوق کے اشتراک سے کوئی تعلق نہیں، اس کے ساتھ خود بلبل کے پیرو نہیں بنتے بلکہ بلبل کو اپنا پیرو بناتے ہیں "دو" کے لفظ پر جو زور دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے صحیح دعوے دار صرف وہی ہو سکتے ہیں، عاشق اور بلبل ان باتوں کے ساتھ زار اور زاری کے اجتماع اور مطلع ہونے نے شعر کو نہایت بلند پایہ کر دیا ہے،

سعدی

اے گنج نوشدارو در خستگان نظر کن

حافظ

چہ عذر راز بخت خود گویم کہ آں عیار شہر آشوب

مرہم بدست و مارا مجروح مے گزاری — بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہان دارد

خواجہ صاحب نے شیخ کے مضمون کا پیرایہ کس قدر لطیف کر دیا ہے،

حافظ	سلمان
عاشق و رند و نظر بازم و میگویم فاش	رندی و عاشقی و قلاشی
تا بدانی کہ بچندین ہنر آراستہ ام	ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست

چستی بندش اور جوش بیان کے علاوہ سلمان صرف یہ کہتے ہیں کہ مجھ میں یہ سب باتیں ضرور ہیں، اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان باتوں پر اُن کو فخر ہے یا ندامت، خواجہ صاحب صرف ان اوصاف کے پائے جانے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کو باعث ناز قرار دیتے ہیں، ع تا بدانی کہ بچندین ہنر آراستہ ام،

حافظ	سلمان
گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں	مکن ملامت رندان دگر بہ بدنامی
مانمے خواہیم ننگ و نام را	کہ ہرچہ پیش تو ننگ است نزد ما نام است

سلمان کہتے ہیں کہ ہم کو ملامت نہ کرو کیونکہ جس چیز کو تم ننگ سمجھتے ہو وہی ہمارے نزدیک ناموری کی بات ہے، اس مضمون میں یہ نقص ہے کہ اس سے اس قدر پھر ثابت ہوتا ہے کہ اُن کو نام کی خواہش ہے، گو وہ نام اوروں کے نزدیک ننگ ہے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم کو نام و ننگ سے سرے سے غرض ہی نہیں اور رندی کی یہی شان ہے،

حافظ	سلمان
شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد	شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل
بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد	شاہد آں است کہ ایں دارد و آنے دارد

دیدہ ام طلعت زیباش کہ آنے دارد۔

ایں ہمہ شیفتہ من از پے آں مے گردم

اصل مضمون یہ تھا کہ معشوق پن صرف تناسب اعضا کا نام نہیں، بلکہ اصلی چیز ناز و انداز ہے، سلمان نے اس مضمون کو جس طرح ادا کیا، اس میں ایک اور لفظی خوبی یعنی این و آں کا مقابلہ شامل کردیا، جس سے اصل مضمون کا زور بٹ گیا، اس لئے خواجہ صاحب نے اصل مضمون کو صنعت لفظی سے بالکل الگ کرکے بیان کیا، لیکن ایں و آں کا لطف بھی ہاتھ سے دینے کے قابل نہ تھا اس لئے دوسرے موقع پر اس کو زیادہ نمایاں پیرایہ میں ادا کیا،

ایں کہ مے گویند آں بہتر ز حسن　　　یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں، ہم کو صرف نمونہ دکھانا مقصود تھا،

ان جزئی اسالیب سے قطع نظر کرکے کلی اسالیب پر نظر ڈالو خواجہ صاحب نے جن مضامین کو زیادہ تر باندھا ہے وہ شراب کی تعریف، رندی و سرمستی کی ترغیب دنیا کی بے ثباتی، واعظوں اور زاہدوں کی پردہ دری ہے، ان میں سے ہر مضمون کے ادا کرنے کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا، اور یہی وجہ ہے کہ انہی مضامین پر اور اساتذہ کے سینکڑوں ہزاروں اشعار موجود ہیں لیکن عام محفلوں میں خواجہ صاحب ہی کے ترانے زبانوں پر ہیں،

واردات عشق

خواجہ صاحب نے شاعری کی مختلف انواع کو لیا ہے اور ہر نوع کو اعلیٰ رتبہ پر پہنچایا ہے، لیکن ان کی اصلی شاعری، عشق و عاشقی اور رندی و سرمستی ہے، رندانہ مضامین وہ جس آزادی، رنگینی اور جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اس کی تفصیل جوش بیان کے

عنوان میں گذر چکی، عشقیہ مضامین سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے لیکن یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہئے (جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ آئے ہیں) کہ خواجہ صاحب کے عشقیہ جذبات غم اور درد سے کم تعلق رکھتے ہیں، وہ فطرۃً شگفتہ مزاج اور رنگین طبع تھے، اس لئے عشق و عاشقی سے ان کو وہیں تک تعلق ہے جہاں تک لطف طبع اور شگفتگی خاطر کے کام آئے، وہ نا امیدی، حسرت، یاس وغیرہ کچھ لکھتے ہیں تو محض تقلید ہوتی ہے، وہ غمگین منہ بنانا بھی چاہتے ہیں تو چہرہ سے شگفتگی نہیں جاتی، اس بنا پر وہ شوق، ناز و نیاز، بوس و کنار، بزم آرائی، مجلس افروزی کے جذبات اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں، وہ اس قسم کا عشق نہیں کرتے کہ کسی کے پیچھے زندگی برباد کر دیں گلیوں میں پڑے پھریں، اُن کا عشق بھی لطف نظر ہے، اچھی صورت سامنے آئی دیکھ لی دل تازہ ہو گیا، پاس بیٹھ گئے، ہمزبانی کا لطف اُٹھایا، زیادہ پھیلے تو سینہ سے لگا لیا گلے میں باہیں ڈال دیں، اس حالت میں بھی کوئی بُرا خیال نہیں پاکبازی اور پاک نظری کی روک قائم ہے، خود فرماتے ہیں،

منم کہ شہرۂ شہرم بعشق ورزیدن　　منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

با ایں ہمہ عشق و محبت میں جو جو واردانیں گذرتی ہیں ایک ایک سے باخبر ہیں اور ان سب جذبات کو اُسی سچائی اُسی واقعیت اُسی جوش کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں، جس طرح دل میں آتے ہیں اور یہی اصلی شاعری ہے، وہ کوئی بات نہیں کہتے جب تک کوئی جذبہ دل میں نہیں پیدا ہوتا، معشوق کی تعریف بھی، جو شاعروں کا رات دن کا وظیفہ ہے کرنا چاہتے ہیں تو اُسی وقت کرتے ہیں جب معشوق کی کسی نئی ادا سے دل پر نئی چوٹ پڑتی ہے، ورنہ یوں کچھ کہہ جاتے ہیں تو اُس کو بیکار سمجھتے ہیں، خود فرماتے ہیں،

نکتہ ناسنجیدہ گفتم دلبرا! معذور دار　　عشوۂ فرمائے تا من طبع را موزون کنم

غنی نے اسی بات کو اپنے انداز میں کہا ہے،

جلوۂ حسن تو آورد مرا بر سر شکر ۔۔۔ تو حنا بستی و من مغنے رنگین بستم

خواجہ صاحب اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ عشق محض ظاہری حسن و جمال سے نہیں پیدا ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ عشق نہیں بلکہ ہوس پرستی ہے، عشق کے لئے معشوق میں حسن و جمال کے سوا اور بہت سی ادائیں ہونی چاہئیں، اسی نکتہ کو سلمان ساوجی نے بھی ادا کیا تھا،

شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل ۔۔۔ شاہد آں ست کہ ایں دارد و آنے دارد

لیکن سلمان نے آن کی تخصیص کر دی خواجہ صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں،

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد ۔۔۔ بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

لیکن یہیں تک بس نہیں کرتے، بلکہ آگے بڑھتے ہیں،

ہزار نکتہ دریں کاروبار دلداری است ۔۔۔ کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری است

عاشق جب عشق سے لطف اٹھاتا ہے تو عام فطرت انسانی کے لحاظ سے اوروں کو بھی اس مزہ کے اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے، اس جذبہ کو عجیب لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

مصلحت دید من آں است کہ یاراں ہمہ کار ۔۔۔ بگذارند و سر زلف نگارے گیرند

شہرے پر از حریفان و از ہر طرف نگارے ۔۔۔ یاران اصلائے عشق است گر مے کنید کارے

اس مستی کو دیکھو کہ "یار د کوئی کام کرنا ہے تو بس یہ عشق کرنے کا کام ہے،

عاشق کو جب وصل کا تصور آتا ہے تو یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ معشوق کو طرح طرح سے آراستہ کروں گا، پھولوں کے زیور پہناؤں گا، تخت پر بٹھاؤں گا، اور عرض کروں گا کہ

معشوقانہ انداز سے بیٹھے اور تماشائیوں پر بجلی گرائے، ان جذبات کی تصویر دیکھو،

بہ تخت گل بنشانم بتے چو سلطانے — ز سنبل و سمنش ساز و طوق و یارہ کنم

چنبیلی زیور طوق کنگن

کرشمہ کن و بازار ساحری بشکن — بہ غمزہ رونق بازار سامری بشکن

بہ بادوہ، سر و دستار عالمے۔ یعنی — کلاہ گوشہ بہ آئین دلبری بشکن

لوگوں کی پگڑیاں اچھال

جو عطر سا لی شود زلف سنبل از دم باد — تو قیمتش بہ سر زلف عنبری بشکن

بہ زلف گوئی کہ آئین دلبری مگذار — بہ غمزہ گوے کہ قلب ستگری بشکن

بروں خرام و ببر گوے خوبی از ہمہ کس — سزاے حور بدہ رونق پری بشکن

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ وصل میں دل کے کانٹے نکل جاتے ہیں اور تسکین ہو جاتی ہے
لیکن صاحب ذوق جانتا ہے کہ وصل میں آتش شوق اور بھڑکتی ہے اور دل کا ولولہ کسی
طرح کم نہیں ہوتا، اسی بنا پر عرب کا شاعر کہتا ہے،

بِکُلٍّ تَدَاوَیْنَا فَلَمْ یَشْفِ مَا بِنَا — عَلٰی اَنَّ قُرْبَ الدَّارِ خَیْرٌ مِنَ الْبُعْدِ

یعنی ہم سب کر کے دیکھ چکے، کسی سے تسلی نہیں ہوتی تاہم ہجر سے وصل پھر اچھا ہے،

خواجہ صاحب اس نکتہ کو یوں ادا کرتے ہیں،

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت — وندراں برگ و نوا خوش نالہاے زار داشت

گفتمش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست؟ — گفت مارا جلوہ معشوق دریں کار داشت

معشوق نے چند روز بیوفائی برتی ہے، پھر صاف ہو گیا ہے، عاشق کو پچھلی باتیں یاد آتی
ہیں، لیکن قصداً بھلاتا ہے اور معشوق کو مطمئن کرتا ہے کہ مجھ کو کوئی شکایت نہیں، اتفاقیہ
باتیں تھیں، ہو گئیں، اس حالت کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

گر ز دست زلف مشکینت خطاے رفت رفت — ور ز ہندوی شما بر من جفاے رفت رفت

اس بلاغت کو دیکھو کہ ظلم و ستم کو معشوق کی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ زلف کا نام لیتا ہے اور اس کو ہندو (چور ظالم) کہتا ہے کہ اس سے یہ کیا بعید ہے،

برق عشق از خرمن پشمینہ پوشی سوخت سوخت جور شاہ کامران گر بر گدائے رفت رفت

گر دلم از غمزۂ دلدار تابے بُرد بُرد درمیان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

کبھی عاشق کے دل میں یہ جذبہ اُٹھتا ہے کہ معشوق کو اور لوگ بھی چاہتے ہوں گے، لیکن میری سی جانبازی کون کرسکتا ہے، اُس خیال کو محبت کے انداز سے معشوق کے سامنے بھی ظاہر کرتا ہے،

خواجہ صاحب اس جذبہ کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں،

شبے مجنوں بہ لیلی گفت کاے معشوق بے ہمتا ترا عاشق شود پیدا و لے مجنوں نخواہد شد

اس موقع پر مجنوں کے لفظ نے کیا بلاغت پیدا کی ہے، یہ مضمون سینکڑوں نے باندھا ہے، لیکن یہ پیرایہ کسی کو نصیب نہ ہوا،

بعض وقت جب معشوق کا ناز اور تمکنت حد سے گزر جاتی ہے تو عاشق تنگ آکر کہہ دیتا ہے کہ اتنا بھی حد سے نہ گزرے، دنیا میں اور ہزاروں صاحب جمال ہیں، معشوق بھی جانتا ہے کہ بات سچ ہے لیکن سمجھتا ہے کہ عاشق کے منصب کے خلاف ہے، ان سچے جذبات کو خواجہ صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں،

صبحدم مرغ چمن با گل نو خاستہ گفت ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت

گل بخندید کہ از راست نہ رنجیم، ولے ہیچ عاشق سخنے سخت بہ معشوق نہ گفت

عشق کے جذبات اگرچہ عالم شباب کے لئے خاص ہیں لیکن بڑھاپے میں بھی یہ آگ سرد نہیں ہوتی، عاشق پر اس زمانہ میں مختلف حالات گزرتے ہیں، کبھی کہتا ہے،

ع رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولے،

کبھی خیال کرتا ہے کہ عشق کی گرمی خود جوان بنا دے گی، اس حالت میں کبھی معشوق سے کہتا ہے،

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر کہ سحر گہ ز کنار تو جوان برخیزم

کبھی کہتا ہے۔

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتوان شدم ہرگہ کہ یاد روے تو کردم جوان شدم

اسی بنا پر رکناے کاشی نے کہا ہے ع عشق در ایام پیری چوں بہ سر آتش است،

ان خیالات کے ساتھ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ حالت عبرت انگیز ہے، اس حالت میں خود اپنی حالت پر افسوس کرتا ہے اور عبرت کے لہجہ میں کہتا ہے،

دیدی دلا کہ آخر پیری و زہد و علم بامن چہ کرد دیدۂ معشوقہ باز من

یہ سب اصلی وارداتیں ہیں، جو عاشق کو پیش آتی ہیں، خواجہ صاحب نے ان کو بے کم و کاست ادا کیا ہے،

معشوق جب صاحب جاہ اور عاشق مفلس اور کم مایہ ہوتا ہے تو معشوق کو عاشق کی طرف التفات سے عار ہوتی ہے، لیکن عاشق میں یہ امتیاز ملحوظ نہیں، اس بنا پر قاصد سے خطاب کر کے کہتا ہے،

گر دیگرت بر آں در دولت گذر بود بعد از اداے خدمت و عرض دعا بگو

در راہ عشق فرق غنی و فقیر نیست اے بادشاہ حسن سخن با گدا بگو

غرض اس طرح کے سینکڑوں جذبات ہیں جن کو خواجہ صاحب نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اور جس کی مثال، اساتذہ کے کلام میں نہیں مل سکتی، ہم سرسری طور پر یکجائی

چند اشعار نقل کرتے ہیں،

معشوق کی نسبت بدگمانی،

خوب آں نرگس فتّان تو بے چیزے نیست تاب آں زلف پریشان تو بے چیزے نیست

ظلم کے بعد معشوق کے رحم کی داد،

آفرین بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

رقیب سے چھپ کر سرگوشی،

خدارا اے رقیب امشب زمانے دیدہ برہم نہ کہ من با لعل جان بخشش نہانی یک سخن دارم

معشوق کی عام آمیزی کی شکایت،

زلف در دست صبا گوش بہ پیغام رقیب ایں ہمہ با ہمہ در ساختۂ یعنے چہ

عشق سے پارسائی میں فرق آنے کا خطرہ،

مے نرسم از خرابی ایمان کہ مے برد محراب ابروے تو حضور نماز من

معشوق نے چارہ ساز ہو کر چارہ نوازی نہ کی،

چہ عذر از بخت خود گویم کہ آں عیار شہر آشوب بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہان دارد

با کہ! ایں نکتہ تواں گفت کہ آں سنگین دل کشت ما را و دم عیسے مریم با اوست

بوسہ کے ساتھ گالی کا مزہ،

قند آمیختہ با گل نہ علاج دل ماست بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

با وفا معشوق کی نظیر پیش کر کے معشوق سے التفات کی خواہش،

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

حیا اور رونے کی وجہ سے افشائے راز،

ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز — دگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

اوروں کی کامیابی پر حسرت،

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی — بیاد آر حریفان بادہ پیمارا

داستان عشق کی دلچسپی،

یک قصہ بیش نیست غم عشق ایں عجب — از ہر کسے کہ مے شنوم نامکرر است

معشوق پر فدا ہونے کا انتظار اور اس کا اعتراض،

مے خواستم کہ میرمش اندر قدم چو شمع — او خود گذر بہ من چو نسیم سحر نہ کرد

معشوق کی یاد میں شب گذاری کا لطف،

از صبا پرس کہ مارا ہمہ شب تا دم صبح — بوے زلف تو ہماں مونس جان است کہ بود

معشوق نہ زر سے ہات آتا اور نہ خود ملتفت ہوتا،

از بہر بوسۂ زلبش جان ہمے دہم — اینم نمے ستاند و آنم نمیدہد

اہل تقوی بُرا مانیں تو مانیں، شاہد پرستی نہیں چھوڑی جا سکتی،

شراب لعل کش و روے مہ جبینان بین — خلاف مذہب آنان جمال اینان بین

فلسفہ — خواجہ صاحب کا فلسفہ قریباً وہی ہے جو خیام کا ہے، خواجہ صاحب نے انہی مسائل کو زیادہ تفصیل، زیادہ توضیح، اور زیادہ جوش کے ساتھ ادا کیا ہے، چنانچہ ہم انکو بدفعات بیان کرتے ہیں،

(۱) ان کا فلسفہ اس مسئلہ سے شروع ہوتا ہے کہ انسان کو کائنات کے اسرار اور ان کی حقیقت کچھ معلوم نہیں، اور نہ معلوم ہو سکتی! اس مضمون کو سقراط، فارابی، ابن سینا، خیام سب نے بیان کیا تھا، لیکن خواجہ صاحب جس بلند آہنگی، اور جوش و ادعا کے ساتھ کہتے

ہیں وہ اُن کا خاص حصہ ہے،

بروائے زاہد خود بین! کہ ز چشم من و تو
راز این پردہ نہان است و نہان خواہد بود

انداز بیان کی بلاغت کو دیکھو! کلام کی ابتدا ایسے لفظ سے کی ہے جس سے زاہد کی دعویٰ رازدانی کی سخت تحقیر ظاہر ہوتی ہے، خود بین کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ دعوے صرف خود بینی کی بنا پر ہوتا ہے، زاہد کے ساتھ اپنے آپ کو بھی شریک کر لیا ہے جس سے زاہد کی خاطرداری اور دعوے کی تعمیم مقصود ہے، یعنی اس امر میں عارف و زاہد، عالم و جاہل سب برابر ہیں دوسرے مصرع میں ماضی کے ساتھ آیندہ زمانہ کو بھی داخل کر لینے سے دعوے میں زیادہ زور اور تعمیم پیدا ہوگئی ہے،

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

حدیث از مطرب و مے گوی و راز دہر کمتر جوے
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

دانا چو دید بازی این چرخ حقہ باز
ہنگامہ باز چید و در گفتگو ببست

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است
اینقدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

ساقیا جام میم دہ کہ نگارندۂ غیب
نیست معلوم کہ در پردۂ اسرار چہ کرد

آں کہ پُر نقش زد این دائرۂ مینائی
کس ندانست کہ در گردش پرکار چہ کرد

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود
گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ دوران را

در کارخانۂ کہ رہ عقل و علم نیست
وہم ضعیف رائے فضولی چرا کند

ما از بروں در شدہ مغرور صد فریب
تا خود درون پردہ چہ تدبیر مے کنند

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

راز درون پردہ چہ داند فلک خموش
اے مدعی نزاع تو با پردہ دار چیست

باہیچ کس نشانے زاں دلستان ندیدم　　یا من خبر ندارم یا او نشان ندارد
مُردم در انتظار و دریں پردہ راہ نیست　　یا ہست و پردہ دار نشانم نمے دہد

(۲) شاہد مطلق کا ظہور اگرچہ ہر جگہ ہے، اور ذرہ ذرہ میں اس کی چمک موجود ہے، لیکن کوئی شخص اس کو پہچان نہیں سکتا،

(۳) اسرار کائنات اگرچہ حقیقت میں معلوم نہیں ہوسکتی، لیکن جو کچھ بھی معلوم ہوسکتا ہے وہ علوم درسیہ کی تحصیل اور بحث مباحثہ سے نہیں معلوم ہوسکتا، بلکہ مجاہدہ، ریاضت، وجدان اور کشف سے معلوم ہوسکتا ہے، خواجہ صاحب نے ارباب ذوق اور مشاہدہ کا نام ساقی، بادہ فروش، رند، رکھا ہے اور اسی بنا پر ہر جگہ پیر مغان اور بادہ فروش کے حلقہ بگوشی کا دعوے کرتے ہیں، اور اُن کے مقابلہ میں زہاد یعنے علماے ظاہری کو بے حقیقت سمجھتے ہیں،

راز درون پردہ، ز رندان مست پُرس　　کین حال نیست صوفی عالی مقام را
سرّ خدا کہ عارف سالک بہ کس نہ گفت　　در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست
اے کہ از دفتر عقل آیت عشق آموزی　　ترسم این نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست
سر ز حیرت بہ در میکدہ ہا بر کردم　　چوں شناسای تو در صومعہ یک پیر نبود
حلاج بر سر دار این نکتہ خوش سراید　　از شافعی مپرسید امثال این مسائل

مرزا غالب نے اس خیال کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے،

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است　　بردار توان گفت و بہ ممبر نتوان گفت

(۴) صوفیہ کے نزدیک علم حاصل ہونے کا ذریعہ بیرونی چیزوں کا مطالعہ نہیں ہے،

اُن کے نزدیک دل پر جب ایک خاص طریقہ سے توجہ، اور مدت تک اس پر مواظبت کی جاتی ہے تو دل خود ادراکات اور معلومات کا سرچشمہ بن جاتا ہے، جس طرح انبیا کا علم باہر سے نہیں آتا بلکہ فوارہ کی طرح اندر سے اچھلتا ہے خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو نہایت پرجوش اور بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے،

دیدمش خورم و خندان قدح بادہ بدست | وندران آئینۂ صد گونہ تماشا میکرد
گفتمش این جام جہان بین بتو کے داد حکیم | گفت آں روز کہ این گنبد مینا مے کرد

یعنی میں نے ساقی (عارف) کو دیکھا کہ خوشی سے کھلا جاتا ہے، ہات میں شراب کا پیالہ ہے اس کو بار بار دیکھتا ہے، اور اس میں اس کو گوناگون عالم نظر آتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کارپردازِ فطرت نے تم کو یہ جام جہان بین کس دن عنایت کیا تھا، بولا کہ جس دن یہ سبز گنبد (آسمان) تعمیر کر رہا تھا،

(۵) خواجہ صاحب کا میلان زیادہ تر جبر کی طرف معلوم ہوتا ہے یعنی انسان خود مختار نہیں ہے کوئی اور قوت ہے جو اس سے کام لے رہی ہے، اگرچہ بعض جگہ اس کے خلاف بھی ان کے قلم سے نکل جاتا ہے مثلاً

ع ہر عمل اجرے و ہر کار جزاے دارد،

لیکن اُن کا رجحان طبع جبر ہی کی طرف ہے، یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر خلاف عقل ہے لیکن فلسفہ کی انتہائی منزل یہی ہے، اور ارباب فنا بھی اسی نشہ میں چور ہیں، خواجہ صاحب جب اس عالم میں آتے ہیں تو اُن کی سرمستی حد سے بڑھ جاتی ہے اور عجیب جوش و خروش کا عالم ہوتا ہے،

نقش مستوری و مستی نہ بدست من و تست | انچہ استاد ازل گفت، بکن آں کردم

بارہا گفتہ ام و بار دگر مے گویم — کہ من دل شدہ ایں رہ نہ بخود مے پویم
بروائے ناصح و بر دُرد کشان خردہ مگیر — کار فرمائے قدر مے کند ایں من چہ کنم
برق غیرت کہ چنیں مے جہد از پردۂ غیب — تو بفرما کہ من سوختہ خرمن چہ کنم
مرا مہر نکو رویاں ز سر بیروں نخواہد شد — قضائے آسمان است و دیگر گون نخواہد شد
مرا روز ازل کارے بجز رندی نفرمودند — ہر آں قسمت کہ آں جا شد کم و افزون نخواہد شد
مستور و مست ہر دو چو از یک قبیلہ اند — ما دل بہ عشوۂ کہ دہیم، اختیار چیست؟
در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — انچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

(۶) کمال اور ترقی کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں یہ غلط ہے کہ ع حریفان بادہا خوردند و رفتند،

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید — دیگران ہم بکنند انچہ مسیحا مے کرد

(۷) بندگان خاص کی فطرت ہی جدا ہوتی ہے وہ بات ہر شخص کو نصیب نہیں ہوسکتی،

گوہر جام جم از طینت خاکِ دگر است — تو توقع ز گل کوزہ گراں میداری

فلسفۂ اخلاق

خواجہ صاحب کی اخلاقی تعلیم، اعلےٰ درجہ کی فلسفۂ انسانیت کی تصویر ہے ان کا طرز عمل خود اُن کی زبان سے یہ ہے،

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن — کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

ع فرض ایزد بگذاریم و بکس بد نہ کنیم،

ما نہ گوئیم بد و میل بہ ناحق نہ کنیم — جامۂ کس سیہ و دلق خود ازرق نہ کنیم

نہ صرف اچھوں بلکہ بردں کو بھی ہم بُرا کہنا پسند نہیں کرتے کیونکہ گو بُرے کو بُرا کہنا چنداں مضایقہ نہیں پھر بھی بُرائی سے خالی نہیں اس لئے سرے سے اس کام کو چھوڑ دینا بہتر ہے

عیب درویش و توانگر بکم و بیش بد است　　　کار بد مصلحت آں است کہ مطلق نکنیم

ہم اپنے نکتہ چینیوں اور مخالفوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتے اس لئے کہ اگر وہ حق کہتے ہیں
تو حق کے بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہیں، اور اگر غلط کہتے ہیں تو غلط بات کا کیا رنج،

حافظ ار خصم خطا گفت نگیریم براو　　　ورکہ حق گفت جدل باسخن حق نہ کنیم

ہماری مجلس عام ہے کسی کی تخصیص نہیں جو چاہے آئے، ہم سب کے ساتھ یکساں برتاؤ
کرتے ہیں، واعظوں اور زاہدوں کی طرح ہمارا اخلاق دوست دشمن عزیز و بیگانہ کافر و
مسلمانوں کی تفریق کی وجہ سے بدلا نہیں کرتا،

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو　　　گیر و دار حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است　　　ورنہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

ہم کو صرف مہر و محبت سے کام ہے دشمنی، بغض، اور کینہ ہمارا طرز عمل نہیں،

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

قفا خوریم و ملامت کشیم و خوش باشیم　　　کہ در طریقت ما کافری است رنجیدن

بہ پیر میکدہ گفتم کہ چیست راہ نجات　　　بخواست جام مے و گفت عیب پوشیدن

فرائض اور عبادات بہشت کے لالچ سے نہیں کرنی چاہئیں بلکہ اس لئے کرنی چاہئیں
کہ فرض انسانی ہیں، بہشت بے شک معاوضہ میں ملے گی لیکن تمہارا مطمح نظر یہ نہیں ہونا
چاہیئے،

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن　　　کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

من آں نگین سلیمان بہ ہیچ نستانم　　　کہ گاہ گاہ براو دست اہرمن باشد

مشہور ہے کہ حضرت سلیمان کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی تاثیر سے تمام جن اور

انسان اُن کے تابع تھے، ایک دفعہ ایک شیطان نے اس کو کسی طرح اُڑا لیا حضرت سلیمان کی سلطنت اور شان شوکت سب جاتی رہی، یہاں تک کہ مچھلیاں بیچکر زندگی بسر کرتے تھے، خواجہ صاحب کہتے ہیں، کہ جس انگوٹھی پر کبھی کبھی شیطان کا قبضہ ہوجاتا ہے، میں اس کو کوڑی کے مول بھی نہیں خریدتا،

گرچہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم　　گر بہ آب چشمۂ خورشید دامن تر کنم

بہ خرمن دو جہان سر فرو نمی آرند　　دماغ کبر گدایان خوشہ چینان بین

ما ملک عافیت نہ بہ لشکر گرفتہ ایم　　ما تخت سلطنت نہ بہ بازو کشادہ ایم

لیاقت جب تک نہ ہو بڑوں کی برابری نہیں کرنا چاہئے،

تکیہ بر جائے بزرگان نتوان زد بگزاف　　مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

ذاتی لیاقت درکار ہے، خاندانی شرف کافی نہیں،

تاج شاہی طلبی گوہر ذاتی بنما　　ور خود از گوہر جمشید و فریدوں باشی

تحصیل مقصد کے لئے کوشش درکار ہے،

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بہ جان　　شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی

ترغیب عمل،

اے دل بکوے عشق گذاری نمے کنی　　اسباب جمع داری و کارے نمے کنی

چوگان بدست داری و گوی نمے زنی　　بازے چنیں بدست و شکارے نمے کنی

علما اور واعظین کی پردہ دری

اخلاقی تعلیم اس بات پر موقوف ہے کہ شاعر فطرت انسانی کا نکتہ شناس ہو جو عیب اور بُرائیاں کُھلی کُھلی ہوتی ہیں، اُن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے لیکن دقیق، مخفی، اور سربستہ عیوب تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی، اس لئے جو شاعر فلسفہ اخلاق کی تعلیم دینا

چاہتا ہے، اس کے لئے فطرت کا نکتہ شناس ہونا سب سے پہلی شرط ہے، اسکے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ لطیف اور دل آویز طریقوں سے یہ عیوب ظاہر کئے جائیں تاکہ لوگوں کو گراں نہ گزریں بلکہ اُن کو اُن کے سُننے میں لطف آئے مخفی اور دقیق عیوب جس قدر علماء واعظین اور زہاد میں پائے جاتے ہیں کسی فرقہ میں نہیں پائے جاتے، چنانچہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے، لیکن چونکہ یہ فرقہ ہمیشہ با اقتدار رہا ہے اس لئے ان کے عیوب کا ظاہر کرنا آسان بات نہیں، امام غزالی نے اس کا جو نتیجہ اُٹھایا، یہ تھا کہ ان کی جان تک معرض خطر میں آگئی، اس لئے کسی کو ہمت نہ ہوئی، شعراء میں سب سے پہلے خیّام نے یہ جرأت کی اس کے بعد شیخ سعدی نے دبی زبان سے کچھ کچھ کہا، مثلاً

محتسب در قفاے رندان است — غافل از صوفیان شاہد باز

بروں نمے رود از خانقہ یکے ہشیار — کہ تا بہ شحنہ بگوید کہ صوفیان مستند

گر کند سیل بہ خوبان دل من خردہ مگیر — کین گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

لیکن جس دلیری، آزادی اور بے باکی سے خواجہ صاحب نے اس فرض کو ادا کیا آج تک کسی سے نہ ہو سکا،

واعظان کین جلوہ بر محراب و ممبر مے کنند — چوں بہ خلوت میروند آں کار دیگر مے کنند

مشکلے دارم ز دانشمند محفل باز پرس — توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر مے کنند

گوئیا باور نمے دارند روز داورے — کیں ہمہ قلب و دغا در کار داور مے کنند

دے دو بتیم چہ خوش آمد کہ سحر گہ مے گفت — بر در میکدہ با دف و نے ترسائے

گر مسلمانی ایں است کہ حافظ دارد — وائے اگر در پس امروز بود فردائے

یعنی کل شراب خانہ کے دروازہ پر ایک عیسائی دف بجا کر یہ گاتا تھا کہ اگر اسلام اسی کا

نام ہے جو حافظ میں پایا جاتا ہے تو آج کے بعد اگر کل قیامت کا دن بھی آنے والا ہے تو ہا ئے،

اس شعر کا پیرایہ بیان بھی کس قدر بلیغ ہے، اول تو جو کہنا ہے اس کو ایک عیسائی کی زبان سے کہا ہے، جس سے علاوہ احتیاط کے مقصود یہ ہے کہ غیروں کو بھی ان بداعمالیوں پر افسوس اور رحم آتا ہے گانے اور بجانے کے شامل کرنے سے یہ غرض ہے کہ اس ذریعہ سے لوگ زیادہ جی لگا کر سنتے تھے اور زیادہ تشہیر ہوتی تھی، اپنا نام لینے سے علاوہ احتیاط کے یہ مقصد ہے کہ دوسروں کا عیب کہتے تو ان کو توجہ نہ ہوتی،

سب سے بڑا عیب مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری کا ہونا ہے اس لئے نہایت دلیری سے اُن کی برائیاں کی ہیں،

گرچہ بر واعظ شہر این سخن آسان نشود
تا ریا ورزد و سالوس، مسلمان نشود

یعنے گو واعظ کو یہ بات گراں گذرے گی، لیکن سچ یہ ہے کہ جب تک وہ ریا کرتا رہے گا، مسلمان نہیں ہو سکتا،

غلامِ ہمت دردے کشاں یک رنگم
نہ آں گروہ کہ ازرق لباس دل سیہ اند

(نیلا)

بادہ نوشی کہ درو ہیچ ریائے نبود
بہتر از زہد فروشی کہ درو روے و ریاست

من از پیر مغان دیدم کرامت ہائے مردانہ
کہ این دلق ریائی را بہ جامی در نمے گیرد

مے خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب
بہتر ز طاعتے کہ بہ روے و ریا کنند

ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست
نان حلال شیخ ز آب حرام ما

بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن
مرو بہ صومعہ کان جا سیاہ کارانند

(خانقاہ)

نقد ہا را بود آیا کہ عیارے گیرند
تا ہمہ صومعہ دراں پئے کارے گیرند

یعنی اگر سکّے پرکھے جاتے تو سب خانقاہ نشین اپنا اپنا راستہ لیتے،

مولویوں اور واعظوں کو اس میں بڑا کمال ہوتا ہے کہ تقدس کے پردہ میں اس طرح بُرائیاں کرتے ہیں کہ کسی کو اُن کی نسبت گمان بھی نہیں ہوسکتا، خواجہ صاحب نے اس نکتہ کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

اے دل طریق مستی از محتسب بیاموز — مست است و در حق او کس این گمان ندارد

خرقہ پوشاں ہمگی مست گذشتند و گذشت[1] — قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

صوفیان واستدند از گرو مے ہمہ رخت (واپس لیا) — دلق ما بود کہ در خانۂ خمار بماند

یعنی صوفیوں نے اپنا خرقہ شراب کی عوض میں رہن بھی کیا اور واپس بھی لے لیا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، ہم رند، یوں رسوا ہوئے کہ ہمارا خرقہ رہن پڑا رہے گا،

داشتم دلقے و صد عیب مرا مے پوشید — خرقہ رہن مے و مطرب شد و زنار بماند

عیب چھپانے کی ایک بڑی گہری چال یہ ہے کہ کوئی اور شخص اگر وہ عیب کرتا ہوا نظر آئے تو نہایت سختی سے اس پر دارو گیر کی جائے، اس راز کو خواجہ صاحب اسطرح فاش کرتے ہیں،

بادہ با محتسب شہر نہ نوشی زنہار — کہ خورد باتو مے و سنگ بہ جام اندازد

یعنی محتسب کے ساتھ کبھی شراب نہ پینا، وہ تمہارے ساتھ شراب بھی پیئے گا اور تمہارا پیالہ بھی توڑ ڈالے گا،

مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری علانیہ نظر آتی ہے اور مذہبی گروہ بھی اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتے، اس بنا پر خواجہ صاحب فرماتے ہیں،

---

[1] یعنی گئی گذری بات ہوئی۔

مے خور کہ شیخ و حافظ و قاضی و محتسب | چوں نیک بنگری ہمہ تزویر مے کنند

صوفیان جملہ حریف اند نظر باز ولے | زاں ہمہ حافظ سودازدہ بدنام افتاد

علما کے اوصاف اور اخلاق پر خوب غور کرو، تو نظر آئے گا کہ عوام کی عقیدتمندی اور نیازمندی کی وجہ سے اُن میں نہایت عجب اور غرور پیدا ہوجاتا ہے، اور اس وصف کو اس لئے ترقی ہوتی جاتی ہے کہ اُن کو یہ باتیں مذہبی پیرایہ میں نظر آتی ہیں، وہ کسی کو بُرا کہتے ہیں، تو سمجھتے ہیں کہ امر بالمعروف کی تعمیل ہے، سلاطین اور حُکام کی دربارداری کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ احکام شرعی کے اجراء کے لئے اس کی ضرورت ہے، کسی سے ذاتی عناد کی وجہ سے دشمنی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ بغض للّٰہ ہے، غرور اور فخر کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ عزت نفس ہے، اس بنا پر یہ تمام عیوب اُن میں راسخ ہوتے جاتے ہیں، خواجہ صاحب ان تمام عیبوں کی نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں پردہ دری کرتے ہیں،

گر از پردہ بروں شد دل من عیب مکن | شکر ایزد کہ نہ در پردۂ پندار بماند

در رہ ما شکستہ دلے مے خرند و بس | بازار خود فروشی ازاں راہ دیگر است

یعنی ہمارے بازار میں صرف خاکساری کی قیمت ہے، باقی خود پرستی تو اس کا راستہ دوسری طرف سے نکلا ہے،

زاہد شہر چو مہر ملک و شحنہ گزید | من ہم ار مہر نگارے بگزینم چہ شود

یعنی جب زاہد نے بادشاہ پرستی اختیار کی، تو ہم بھی اگر کسی خوشرو سے دل لگائیں تو کیا ہرج ہے، یعنے بادشاہ پرستی سے شاہد پرستی بہتر ہے،

اخفائے حق

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو | نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

علما کی عام حالت یہ ہے کہ امر حق کو عوام کی خاطر سے کبھی ظاہر نہیں کرتے بلکہ اگر

اُس میں کوئی بُرائی کا پہلو ہے تو صرف اُسی پر زور دیتے ہیں، آج کل مغربی تعلیم قوم کے لئے کس قدر ضروری اور گویا شرط زندگی ہے لیکن صرف اس وجہ سے کہ عوام اس سے وحشت کرتے ہیں کبھی کوئی عالم اس کی ترغیب نہیں دے سکتا بلکہ ہمیشہ اس کی مخالفت کی جاتی ہو خواجہ صاحب نے نہایت موثر طریقے سے اس عیب پر ملامت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ عوام کی خاطر سے حکمت اور حقیقت سے انکار کرو، شراب میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی اور نقصان فائدہ سے زیادہ ہے تاہم خدا نے قرآن مجید میں فرمایا فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھا۔ یعنی قمار اور شراب میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی، لیکن نقصان زیادہ ہے، جب خدا نے باوجود اس کے کہ شراب نہایت بُری چیز ہے اس کے فائدوں کو چھپانا نہیں چاہا، البتہ یہ بتادیا کہ فائدہ سے نقصان زیادہ ہے، اور اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے تو امر حق کو عوام کی طرف سے چھپانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے،

خواجہ صاحب نے اس بات کو جابجا نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں ادا کیا ہے کہ مولویوں اور واعظوں کی نیکیاں بھی چونکہ ذاتی غرض پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے درگاہ الٰہی میں مقبول ہونے کے قابل نہیں،

در مے خانہ بہ بستند خدایا مپسند | کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند
ترسم کہ صرفۂ نہ برد روز باز خواست | نان حلال شیخ ز آب حرام ما
ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولے | ویں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولے

روزمرہ و محاورہ

خواجہ صاحب کی فصاحت کلام کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں کلام میں روزمرہ اور محاورے نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو الفاظ اور ترکیبیں

رات دن استعمال میں آتے رہتے ہیں اور جن سے روزمرہ پیدا ہوتا ہے، عموماً وہی ہوتے ہیں جو فصیح، سلیس، نرم اور رواں ہوں، اور اگر ان میں کسی قدر کمی ہوتی ہے تو وہ روزمرّہ کے استعمال سے نکل جاتی ہے کیونکہ رات دن سُنتے سُنتے وہ الفاظ کانوں کو مانوس ہوجاتے ہیں، محاورات کا بھی یہی حال ہے، محاورہ اُس وقت بنتا ہے جب ایک گروہ کا گروہ کسی جملہ کو کسی خاص معنی میں استعمال کرتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہ جملہ خود فصیح سلیس، اور رواں ہو، ورنہ تحاوُرِ عام میں نہیں آسکتا،

ایک اور پہلو سے اس خصوصیت پر نظر ڈالو، فارسی زبان میں مفرد الفاظ بہ نسبت اور زبانوں کے نہایت کم ہیں، اس کمی کی تلافی زبان نے محاورات اور مصطلحات سے کی، شاعری کے لئے زبان پر قدرت تام حاصل ہونا سب سے ضروری شرط ہے، خواجہ صاحب کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اُنہوں نے جس قدر محاورات اور مصطلحات برتے، فارسی شعرا میں سے غالباً کسی نے نہیں برتے اور یہ اُن کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل ہے،

خواجہ صاحب کا تمام کلام اگرچہ روزمرّہ محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے لیکن مثال کے طور پر ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں[1]۔

ترسم کہ صرفہ نبرد روز بازخواست (قیامت) — نان حلال شیخ ز آب حرام (شراب) ما

صلاح کار کجا و من خراب کجا — ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

---

[1] جو محاورات ان اشعار میں آئے ہیں اُن کے معنی ہم یکجائی لکھ دیتے ہیں،

صرفہ بُردن[1]، بازی لیجانا، دامِ[2] بازی چیدن، جال کو سمیٹ لینا، باد بدست[3] بودن، کچھ ہات نہ آنا، خدمت[4]، سلام، در سرِ[5] کار چیزے کردن، صرف کردینا، یا لگا دینا، ترا[6] چہ افتادہ است، تم کو کیا پڑی ہے، ہمت[7]، توجہ اور ہمدردی، بد[8] اندام بے ڈول، ازاں[9] راہ دیگر ست، یعنی اس کا اور راستہ ہے،

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چین — کین جا ہمیشہ باد بدست است دام را

اے صبا گر بہ جوانان چمن باز رسی — خدمت از ما برسان سرو و گل و ریحان را

ترسم آں قوم کہ بر درد کشاں مے خوانند — در سر کار خرابات کنند ایمان را

برو بہ کار خود اے واعظ ایں چہ فریاد است — مرا فتادہ دل از کف ترا چہ افتادہ است

روئے خوب است و کمال ہنر و دامن پاک — لاجرم ہمت مردان دو عالم با اوست

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست — ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است — ورنہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

دانا چو دید بازی ایں چرخ حقہ باز — ہنگامہ باز چید و در گفتگو ببست

در راہ ما شکستہ دلے مے خرند و بس — بازار خود فروشی ازاں راہ دیگر است

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است — بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است

مے خواست گل کہ دم زند از رنگ و بوئے دوست — از غیرت صبا نفسش در دہان گرفت

آسودہ بر کنار چو پرکار مے شدم — دوراں چو نقطہ عاقبتم در میان گرفت

فرصت نگر کہ فتنہ در عالم اوفتاد — عارف بجام مے زد و از غم کران گرفت

حافظ چو آب لطف ز نظم تو مے چکید — غیرے چگونہ نکتہ تواند بر آن گرفت

مستم کن آں چناں کہ ندانم ز بے خودی — در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

در حق من لبت آں لطف کہ مے فرماید — سخت خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں

ہمائے ہمتم عمرے ست کز جان — ہوائے آں قد و بالا گرفت است

تیز، جھلا اور غصہ ور، دم زدن، دعویٰ کرنا، نفس در دہان گرفتن، دم گھٹنا، در میان گرفتن گھیر لینا، زدن، کسی چیز پر ٹوٹ کر گرنا، نکتہ گرفتن، اعتراض کرنا، ہوا گرفتن، ہوا میں اڑنا۔

دلم جز مهر مهرویان طریقے بر نمے گیرد
زهر در مے دهم پندش ولیکن در نمے گیرد

رخ چشمے بر این خوبی تو گوئی دل ازو بر گیر
برو کین وعظ بے معنی مرا در سر نمے گیرد

میان گریه می خندم که چون شمع اندرین مجلس
زبان آتشینم هست لیکن در نمے گیرد

بدین شعر تر و شیرین ز شاهنشه عجب دارم
که سر تا پاے حافظ را چرا در زر نمے گیرد

یا وفا یا خبر وصل تو یا مرگ رقیب
بازی چرخ ازین یکدو سه کاری بکند

نقطه ها را بود آیا که عیارے گیرند
تا همه صومعه داران پے کاری گیرند

خرقه پوشان همگی مست گذشتند و گذشت
قصه ماست که در کوچه و بازار بماند

مطرب عشق عجب ساز و نوائے دارد
نقش هر پرده که زد راه بجائے دارد
جو راگ چھیڑا

از راه نظر مرغ دلم گشت هوا گیر
اے دیده نظر کن که بدام که در اُفتاد

بس تجربه کردیم درین دیر مکافات
با درد کشان هر که در افتاد بر افتاد

چه مستی است ندانم که رو بما آورد
که بود ساقی؟ و این باده از کجا آورد

رسیدن گل و نسرین به خیر و خوبی باد
بنفشه شاد و خوش آمد سمن صفا آورد

از دیده خون دل همه بر روے ما رود
بر روے ما ز دیده ندانم چها رود

من و انکار شراب! این چه حکایت باشد
غالباً این قدرم عقل کفایت باشد

آن شد اے خواجه که در صومعه باز م بینی،
کار ما با رخ ساقی و لب جام اُفتاد

رطل گرانم ده اے مرید خرابات،
شادئ شیخی که خانقاه نه دارد

در گرفتن، اثر کرنا، یا لگ جانا، در زر گرفتن، سونے میں تلوا دینا، پے کارے گرفتن، کسی کام کے پیچھے پڑنا، لیکن ایسے موقعوں پر اپنا راستہ لینا، کے معنے میں آتا ہے، گذشت، گئی گذری بات ہوئی، راہ بجائے دارد، اصول اور قاعدہ کے موافق ہے، در افتادن اُلجھنا، صفا آورد، خیر مقدم کے وقت کو کہتے ہیں، چها رود، کیسے گذریگی، شادی شیخی، یعنے اُنکے آنے نہیں، بہ فلان بخشیدن، اُن کے صدقہ ہیں،

شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد   زدیم بر صفِ رندان، و ہر چہ بادا باد

یارب بوقت گل گنہ بندہ عفو کن   ویں ماجرا بہ سرو لبِ جوئبار بخش

حاشا کہ من بہ موسم گل ترک مے کنم   من لاف عقل میزنم، ایں کار کے کنم

اے مگس عرصۂ سیمرغ نہ جولانگہ تست   عرض خود مے بری و زحمت[1] ما مے داری
(آبرو)

دردمنداں بلا زہر ہلاہل نوشند   قتل ایں قوم خطا باشد، ہاں تا[2] نہ کنی

اکثر محاورے ایسے ہیں جو صرف بول چال اور بے تکلفی میں استعمال ہوتے ہیں، اہل قلم یہ سمجھ کر کہ وہ متانت کے خلاف ہیں تصنیفات میں استعمال نہیں کرتے، مثلاً اردو میں یہ محاورات "جا و بھی، رہنے بھی دیجئے، دیکھ لیا" وغیرہ وغیرہ روزمرہ استعمال میں آتے ہیں لیکن ناسخ، خواجہ درد، سودا وغیرہ ان کو نظم متانت کے خلاف سمجھتے ہیں، لیکن اس سے زبان کی وسعت گھٹتی ہے، اس لئے جن شعرا کو زبان کا خیال زیادہ ہے مثلاً داغ وغیرہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یہ تمام محاورات لاتے ہیں، فارسی میں روزمرہ اور محاورہ کو خواجہ صاحب نے وسعت دی، ان کے کلام میں ایسے بہت سے محاورات ملیں گے جو کسی اور کے کلام میں نہیں مل سکتے، یہاں تک کہ بول چال کے لحاظ سے وہ محاورات بھی خواجہ صاحب نے لے لئے ہیں جو خاص لہجہ کے محتاج ہیں اور بغیر اس لہجہ کے سمجھ میں نہیں آسکتے، مثلاً

ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہنر دارد عشق   گفتم اے خواجۂ غافل ہنرے بہتر ازیں

ہنرے بہتر ازیں، کو ایک خاص لہجہ سے پڑھنا چاہئے، جس سے استفہام کے معنے پیدا ہوں، یعنی کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور ہنر ہوگا، یا مثلاً یہ شعر ع

کنار دوست و دوصلش چگویم چوں نخواہد شد،

[1] زحمت کسے بر داشتن، کسی کو ستانا، [2] ہاں تا نہ کنی، دیکھو ایسا کبھی نہ کرنا،

یعنی جب یہ ہونا نہیں ہے تو اس کا ذکر کیا کروں، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں،

خوش نوائی صاحب ذوق صاف محسوس کرتا ہے، کہ خواجہ صاحب کے کلام میں ایک خاص قسم کی خوش گواری پائی جاتی ہے، شاعری میں موسیقی بھی شامل ہے، اس لئے جو شعر موسیقی اور خوش نوائی سے الگ ہوگا شاعری کے رتبہ سے گھٹا ہوگا، خواجہ صاحب کے کلام میں یہ وصف مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اکثر وہ غزلوں کی بحریں ایسی رکھتے ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں، شعروں کے ارکان اور اُن کے ٹکڑے ایسے لاتے ہیں جو تال اور سم کا کام دیتے ہیں، اس غرض کے لئے اکثر ہموزن الفاظ کا پے در پے آنا مدد دیتا ہے، اور گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بار بار تان آکر ٹوٹتی ہے مثلاً،

چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش — کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

یکے از کف مے لافد دگر طامات مے بافد — بیا کیں داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقان ریزد — من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

شراب ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزیم — نسیم عطر گردان را شکر در مجمر اندازیم

سرو بروان من چرا میل وطن نمیکند — ہمدم گل نمے شود، یاد وطن نمے کند

دردم از یارست و درمان نیز ہم — دل فدائے او شد و جان نیز ہم

گر ز دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت — ور ز ہندوی شما بر من جفائے رفت رفت

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے قدما کے کلام میں **صنائع لفظی** یعنے صنعت اشتقاق، ترصیع، ایہام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، مراعات النظیر کو (تناسب لفظی)، جو حد سے گذر کر ضلع جگت بن جاتی ہے سلمان ساوجی نے رواج دیا اور کچھ زمانہ تک بڑے زور و شور سے جاری رہی، ان صنعتوں کو عموماً شعرا نے محض صنعت کی حیثیت سے

استعمال کیا یعنی اس لحاظ سے کہ اس کا التزام دقت آفرینی ہے اور دقت آفرینی ایک کمال کی بات ہے، اس عام رو سے خواجہ صاحب بھی نہ بچ سکے، چنانچہ مراعات النظیر اور ایہام وطباق اُن کے ہاں بھی جا بجا پائے جاتے ہیں، مثلاً،

زاں سفر دراز خود قصد وطن نے کند — تا دل ہرزہ گرد من رفت بہ چین زلف او

بدہ بہ شادی روح روان حاتم طے — سخا نماند سخن طے کنم شراب کجا است

ع نان حلال شیخ ز آب حرام ما،

لیکن خواجہ صاحب نے زیادہ تر اُن لفظی صنعتوں کو لیا ہے جن سے خوش آہنگی اور خوش نوائی پیدا ہوتی ہے مثلاً،

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم — ایں کہ مے گویند آں بہتر ز حسن

اس شعر میں ایں و آں کا جو مقابلہ ہے اُس کو ایک سطحی النظر بہ خیال کرے گا کہ مراعات النظیر یا صنعت اضداد ہے لیکن ایک صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ ان دو لفظوں کی آواز کا تناسب ایسا ہے جو خود بخود کانوں کو خوش معلوم ہوتا ہے اور موسیقی کی حیثیت سے دیکھیں تو گویا گیت کے اجزا ہیں، مثلاً،

چہ شود گر بہ سلامے دل ما شاد کنند — قاصد حضرت سلمے کہ سلامت بادا

اس میں سلمی سلامت اور سلام جو ملتے جلتے الفاظ آئے ہیں اُن سے عام آدمی کو صنعت اشتقاق کا خیال پیدا ہوگا، لیکن اصل میں یہ متناسب الفاظ ذرا ذرا سے فاصلہ پر بار بار آکر کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتے ہیں، یا مثلاً،

خدمت ما برساں سرو و گل و ریحاں را — اے صبا گر بہ جوانان چمن باز رسی

اس شعر میں سرو و گل و ریحان جو الفاظ آگئے ہیں، عام لوگ اس کا نام مراعات النظیر

یا صنعت اعداد وغیرہ رکھیں گے لیکن اس شعر کی بحر اور اُس میں خاص ان تناسب الوزن الفاظ کا اخیر میں آنا ایک خوش نوائی پیدا کرتا ہے جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھی حالانکہ یہ ممکن تھا کہ وہ صنعتیں باقی رہتیں،

خواجہ صاحب کے کلام میں جہاں اس قسم کی صنعتیں نظر آئیں غور سے دیکھو تو اُن میں دراصل خوش نوائی اور خوش آہنگی کا وصف ملحوظ ہوتا ہے، ملاحظہ ہو،

اعتمادے نیست بر دور جہان — بلکہ بر گردون گردان نیز ہم

از بہر دستہ زلبش جان ہمے دہم — اینم نمے ستانند و آنم نمے دھند

شیوۂ ناز شیریں خط و خال تو ملیح — چشم و ابروے تو زیبا قد و بالاے تو خوش

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلا را

گر ز دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت — ور ز ہندوی شما بر من جفائے رفت رفت

برق عشق ار خرمن پشمینہ پوشی سوخت سوخت — جور شاہ کامران گر بر گدائے رفت رفت

گر دلم از غمزۂ دلدار تابے برد برد — در میان جان و جانان ماجرائے رفت رفت

غور کرو ان اشعار میں جہاں جہاں مکرر الفاظ آئے ہیں کس قدر کانوں کو خوش معلوم ہوتے ہیں، ظاہر بین اس کو صنعت تکرار کہہ دیگا، لیکن کیا ہر جگہ کسی لفظ کا مکرر آنا کوئی لطف پیدا کرتا ہے،

کاروان رفت تو در خواب و بیابان در پیش — کے روی؟ رہ زکہ پرسی؟ چہ کنی؟ چون باشی؟

مصرع اخیر میں تم کو خیال ہوگا کہ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ پے در پے سوالات آتے ہیں جس سے صنعت استفہام پیدا ہو گئی ہے، لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھو، یہ الفاظ کس طرح کانوں کو ایک خاص تناسب کھٹکا دیتے ہیں اور خوش آہنگ معلوم ہوتے ہیں،

خدارا رحمی اے منعم کہ درویش سر کویت
درے دیگر نہ دانا رہ دیگر نہ گیرد

بندش کی چستی — بندش کی چستی ایک وجدانی چیز ہے اس کی تعریف اور تحدید نہیں ہو سکتی لیکن مذاق صحیح آسانی سے اس کو احساس کرتا ہے، مثلاً ان اشعار میں باوجود اتحاد مضمون و الفاظ کے بندش کی چستی کا جو فرق ہے ہر شخص محسوس کر سکتا ہے،

سلیم — مشاطہ را جمال تو دیوانہ مے کند
کائینہ را خیال پری خانہ مے کند

صائب — دل را نگاہ گرم تو دیوانہ مے کند
آئینہ را رخ تو پری خانہ مے کند

غنی — ہر کس کہ دید روے تو دیوانہ میشود
آئینہ از رخ تو پری خانہ مے شود

صائب — سر چشمۂ حیات لب مے چکان اوست
عمر دوبارہ سایۂ سرو روان اوست

نظرت — عیش ابد بہ کام دل دردمند تست
عمر دوبارہ سایۂ سرو بلند تست

صائب — ہمیشہ صاحب طول امل غمین باشد
کہ چین بقدر بلندی در آستین باشد

بیدل — دستگاہ ہت ہر قدر بیش است کلفت بیشتر
در خور طول است چین جامے کہ دارد آستین

خواجہ صاحب جیسا کہ خود انہوں نے متعدد موقعوں پر تصریح کی ہے، سلمان اور خواجو کی غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں، ان غزلوں کے مقابلہ کرنے سے بندش کے زور اور چستی کا فرق صاف نظر آجاتا ہے،

حافظ

سلمان

ہمچناں مہر توام مونس جان است کہ بود
ہمچناں ذکر توام ورد زبان است کہ بود

گوہر مخزن اسرار ہماں است کہ بود
حقۂ مہر بدان مہر و نشان است کہ بود

مونس جان کے قافیہ کے جواب میں خواجہ صاحب کا شعر ہے،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دم صبح
بوے زلف تو ہماں مونس جان است کہ بود

حافظ	سلمان
عاشقان بندۂ ارباب امانت باشند	شوقم افزون شد و آرام کم و صبر نماند
لاجرم چشم گہر بار ہمان است کہ بود	در فراق تو دلے عہد ہمان است کہ بود

اس شعر میں سلمان کی بندش کی سستی صاف ظاہر ہے "در فراق تو" کا موقع پہلے مصرع کے ابتدا میں ہے، وہاں سے الگ ہو کر دلے کے ساتھ اس کی ترکیب بالکل بے مزہ ہو گئی ہے،

حافظ	سلمان
طالب لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید	کے بود کے کہ بگویند سراسر اغیار
ہمچنان در عمل معدن و کان است کہ بود	کہ فلان یار ہمان یار فلان است کہ بود
عکس روے تو چو در آئینۂ جام افتاد	در ازل عکس مے لعل تو در جام افتاد
عارف از پر تو مے در طمع خام افتاد	عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد

جام کے قافیہ میں حافظ کے اور اشعار ملاحظہ ہوں،

کار من بارخ ساقی ولب جام افتاد	آں شد اسے خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی

حافظ	سلمان
صوفیان جملہ حریف اند و نظر باز و لے	عشق بر کشتن عشاق تفاؤل مے کرد
زاں میان حافظ سودا زدہ بدنام افتاد	اولین قرعہ کہ زد بر من بدنام افتاد
در خم زلف تو آویخت دل از چاہ زنخ	خال مشکین تو در عارض گندم گون دید
آہ کز چاہ برون آمد و در دام افتاد	آدم آمد زپے دانہ و در دام افتاد

ان اخیر کے دونوں شعروں کے مقابلہ سے بندش کی چستی کا مفہوم تم کو علانیہ واضح

ہو جائے گا، سلمان کا شعر اگرچہ معنے کے لحاظ سے بالکل ناموزون ہے، چہرہ کو دام سے کوئی مناسبت نہیں بخلاف اس کے خواجہ صاحب نے ذقن کو چاہ اور زلف کو دام کہا ہے اور یہ عام مسلمہ تشبیہ ہے، لیکن سلمان کے شعر میں بندش کی جو چستی ہے، خواجہ صاحب کے شعر میں نہیں، مصرع آدم آمد زپے دانہ دردام اُفتاد، آدم، دانہ، دام، یہ الفاظ ایسی ترتیب اور خوبصورتی اور روانی سے جمع ہو گئے ہیں کہ مصرع میں نہایت برجستگی پیدا ہو گئی ہے، خواجہ صاحب کا مصرع پھُس پھُسا ہے، اور خصوصاً آہ کے لفظ نے مصرع کو بالکل کم وزن کر دیا ہے،

حافظ	سلمان
آں کہ از سنبل او غالیہ تابے دارد	دام زلف تو بہر حلقہ طنابے دارد
باز با دل شدگان ناز و عتابے دارد	چشم مست تو بہر گوشہ خرابے دارد
چشم من کرد بہر گوشہ روان سیل سرشک	خوان چشم من ازاں ریخت کہ تا ظن نہ برم
تا سہی سرو ترا تازہ بہ آبے دارد	کہ برش مردم صاحب نظرے آبے دارد
ماہ خورشید نمایش ز پس پردہ ز زلف	رسن زلف تو سر رشتۂ جان من و شمع
آفتابے است کہ در پیش سحابے دارد	ہر یک از آتش رخسار تو تابے دارد
شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد	آں کہ زابرو و مژہ تیر و کمانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد	چشم ہا کردہ سیہ قصد جہانے دارد

ان مقابلوں سے بندش کی چستی اور زور کا مفہوم اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا

اب خواجہ صاحب کے اشعار ذیل کو اس نظر سے دیکھو،

واں پیر سالخوردہ جوانی ز سر گرفت	آں شمع سر گرفتہ دگر چہرہ بر فروخت

آں عشوہ داد عشق کہ مفتی ز رہ برفت | واں لطف کرد دوست، کہ دشمن حذر گرفت
زنہار زاں عبارت شیریں و دل فریب | گوئی کہ پستۂ تو سخن در شکر گرفت
من ایستادہ تا کنمش جان فدا چو شمع | او خود گذر بمن چو نسیم سحر نہ کرد
ماہی و مرغ دوش نخفت از فغان من | واں شوخ دیدہ بین کہ سر از خواب برنکرد
بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من | کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من
دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست | وندراں آئینہ صد گونہ تماشا مے کرد
گفتم ایں جام جہان بین بتو کے داد حکیم | گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا مے کرد
زلفین سیہ خم بہ خم اندر زدۂ باز | بخت من شوریدہ بہم برزدۂ باز
بر شیشہ صبرم زدۂ سنگ دلیکن | با تو چہ توان گفت کہ ساغر زدۂ باز

ہمارے نزدیک حسن کلام کا بڑا جوہر یہی حسن بندش ہے،

جاحظ کا قول ہے کہ مضمون بازاریوں تک کو سوجھتے ہیں، جو کچھ فرق اور امتیاز ہے لطف ادا اور بندش کا ہے، سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک مضمون کسی شاعر نے باندھا بعینہٖ وہی مضمون دوسرے نے باندھا، الفاظ تک اکثر مشترک ہیں لیکن لفظوں کے اُلٹ پلٹ اور ترتیب سے وہی مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا،

شوخی وظرافت

خواجہ صاحب کے کلام میں جا بجا شوخی اور ظرافت بھی ہے لیکن نہایت لطیف اور نازک ہے، شیخ سعدی اور خیام بھی ظرافت کرتے ہیں، لیکن زیادہ کھل جاتے ہیں، خواجہ صاحب کی شوخی طبع کی لطافت دیکھو،

واعظ شہر کہ مردم ملکش مے خوانند | قول ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست
یعنی واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں، اس قدر تو ہمکو بھی تسلیم ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے،

(رباعی فرشتہ ہے! یا شیطان اس کا فیصلہ ہوتا رہیگا)

بکوے میفروشانش بجامے در نمے گیرند | زہے سجادۂ تقوے کہ یک ساغر نمے ارزد
گر ز مسجد بخرابات شدم عیب مگیر | مجلس وعظ دراز است و زمان خواہد شد

یعنی میں اگر مسجد سے اٹھ کر شراب خانہ میں چلا گیا تو اعتراض کی کیا بات ہے،

وعظ تو ابھی دیر تک ہوتا رہے گا، میں پی کے چلا آؤں گا،

اسی مضمون کو قائم نے اُردو میں ادا کیا ہے،

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم | یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

حافظ

محتسب خم شکست و بندہ سرش | سن بالسن والجروح قصاص

قرآن مجید میں قصاص کی آیت میں مذکور ہے کہ زخم کا بدلا زخم ہے، مثلاً اگر کوئی کسی

کا دانت توڑ ڈالے تو اس کا بھی دانت توڑ ڈالا جائے گا،

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ محتسب نے خم شراب کو توڑ ڈالا تھا، میں نے قصاص

کے حکم کے موافق اس کا سر توڑ دیا،

پدرم روضۂ رضوان بدو گندم بفروخت | نا خلف باشم اگر من بجوے نفروشم

میرے باپ (حضرت آدم) نے بہشت کو گیہوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا تھا، میں اگر

ایک جو کے بدلہ میں نہ بیچوں تو نا خلف ہوں،

من و انکار شراب! ایں چہ حکایت باشد | غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد

میں اور شراب کا انکار!! غالباً مجھے تو اتنی ہی عقل کافی ہے، یعنے یہ سمجھ لوں کہ شراب

چھوڑنا مجھ کو زیبا نہیں، اس سے زیادہ عاقل اور دور اندیش ہونا مجھ کو ضرور نہیں،

نہ من زبے عملی در جہان ملولم و بس ملامت علما ہم ز علم بے عمل است

میں بیکاری سے (یعنی شراب وغیرہ کا مشغلہ نہیں ہے) دل گرفتہ ہوں، بے عمل ہونا بُرا ہے اسی لئے عالم بے عمل بھی اچھا نہیں ہوتا،

نقد دمے کہ بود مرا صرف بادہ شد تاب سیاہ بود بہ جائے حرام رفت

قلب دل کو بھی کہتے ہیں اور کھوٹے سکہ کو بھی، اس بنا پر کہتے ہیں کہ میرا قلب اگر شراب میں صرف ہوا تو ہونا ہی چاہئے تھا، ع مال حرام بود بجائے حرام رفت،

مسلسل مضامین ایشیائی غزل گوئی کا ایک بڑا عیب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی خیال کو مسلسل نہیں ظاہر کر سکتے، ہر غزل متعدد اور مختلف بلکہ متناقض مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے، غزل کے جو عمدہ مضامین ہیں مثلاً حُسن، عشق، سراپائے معشوق، وصل، ہجر، ہزار دفعہ بندھے ہیں لیکن ان میں سے کسی مضمون کی نسبت کوئی مسلسل اور تفصیلی بیان کہیں نہیں مل سکتا، اگرچہ حقیقت میں یہ چنداں اعتراض کی بات نہیں، مُسلسل خیالات کے لئے مثنوی کی صنف متعین کردی گئی ہے، قصائد اور قطعات سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے، غزل اس صورت کے لئے خاص کردی گئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے مفرد خیالات جو شاعر کے دل میں آتے رہتے ہیں، ضائع نہ جانے پائیں اس صنف کے لئے نہایت قادر الکلامی درکار ہے، یورپ کو اپنی شاعری پر ناز ہے، لیکن وہ کسی خیال کو دو چار شعروں سے کم میں نہیں ادا کر سکتے بخلاف اس کے ہمارے شعرا نہ صرف چھوٹی چھوٹی باتیں بلکہ نہایت وسیع اور بڑے مضامین کو بھی ایک شعر میں ادا کردیتے ہیں، جو اختصار کی وجہ سے فوراً زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جو اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ اُن کے لئے مثنوی یا قصائد کی وسعت درکار ہو، نہ اتنے مختصر کہ ایک دو

شعروں میں سما جائیں، اس لئے اس قسم کے مضامین کے لئے غزلیں ہی مناسب ہیں، اس صورت میں ضرور ہے کہ غزل مسلسل ہو یعنے پوری غزل یا غزل کے متعدد اشعار ایک ہی مضمون کے لئے خاص کر دیئے جائیں، اس قسم کی غزل کا رواج اگرچہ عام نہیں ہوا تاہم جستہ جستہ پائے جاتے ہیں اور سب سے پہلے خواجہ صاحب نے اس کو ترقی دی، ان کی اکثر غزلوں میں ایک خاص خیال یا ایک خاص سماں دکھایا گیا ہے، اس قسم کی چند غزلوں کے مطلع ہم نقل کرتے ہیں،

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

بود آیا کہ در میکدہا بکشایند
گرہ از کار فرو بستہ ما بکشایند

بامدادان کہ بہ خلوت گہ کاخ ابداع
شمع خاور فگند بر ہمہ اطراف شعاع

اے پیک پی خجستہ چہ نامی فدیت لک
ہرگز سیاہ چردہ ندیدم برایں نمک

گر ز دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت
ور ز ہندوی شما بر من جفائے رفت رفت

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بہ وجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

(بہار کے ذکر میں ہے)

یاد باد آں کہ نہانت نظرے با ما بود
رقم مہر تو بر چہرۂ ما پیدا بود

پوری غزل میں پہلی دلچسپیوں کو یاد دلایا ہے، اور ہر شعر یاد باد سے شروع ہوتا ہے،

خوشا شیراز و وضع بے مثالش
خداوندا نگہدار از زوالش

(شیراز کی تعریف میں ہے)

نسیم صبح سعادت بداں نشاں کہ تو دانی
خبر بکوی فلاں بر بداں زماں کہ تو دانی

(قاصد سے پیغام کہا ہے)

ابن یمین فریومدی

باپ کا نام محمود ہے، قوم کے ترک تھے، اور ترکستان وطن تھا، سلطان محمد خدا بندہ کے زمانہ میں خراسان میں آئے اور فریومد میں جو ایک قصبہ کا نام ہے قیام اختیار کیا، یہاں زمین اور جائدادیں خریدیں، یہ الجائتیو سلطان کا عہد حکومت تھا، اور علاء الدین محمد وزیر السلطنت تھے، علاء الدین نے ان کی نہایت قدردانی کی، شعر کہتے تھے یہ رباعی اُن کے انداز کلام کا نمونہ ہے،

دارم ز عتاب فلک بوقلموں ‏ ‏ ‏ ‏ وز گردش روزگار خس پرور دون
چشمے چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک ‏ ‏ ‏ ‏ جانے چو میانہ پیالہ ہمہ خون

ابن یمین فریومد میں پیدا ہوئے، باپ نے شاعری کی تعلیم دی، اکثر جن طرحوں پر خود کہتے تھے، بیٹے سے بھی کہلاتے تھے، چنانچہ اوپر کی رباعی پر ان کی رباعی بھی ہے،

دارم ز جفائے فلک آئینہ گون ‏ ‏ ‏ ‏ پرآہ دلے کہ سنگ ازو گردد خون
روزے بہ ہزار غم بہ شب روز آرم ‏ ‏ ‏ ‏ تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیرون

ابتدا میں سربداروں کی مداحی کرتے تھے،

بالآخر فقر و قناعت اختیار کی، اور شاہی تعلقات سے کنارہ کش ہو گئے، تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی اس کی کاشتکاری سے زندگی بسر کرتے تھے، ۸ جمادی الثانی ۷۶۹ھ میں وفات پائی، مرتے وقت یہ رباعی لکھی تھی،

منگر کہ دل ابن یمین پرخون شد ‏ ‏ ‏ ‏ بنگر کہ ازیں سرائے فانی چون شد

مصحف بہ کف و چشم بہ رہ، روے بہ دوست | باپیک اجل غمزہ زنان بیروں شد

کلام — ان کا دیوان سربداروں کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا، غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں کہ میں نے اُن کا دیوان دال کی ردیف تک دیکھا ہے، لیکن یہ غالباً قطعات کا دیوان ہوگا، تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہ غزل اور قصائد سب کچھ کہتے تھے، ید بیضا میں اُن کی غزل کے بعض اشعار نقل کیے ہیں،

سرزدہ اسے دیدہ ہر دم اشک غماز مرا | تا نسازد فاش پیش مردمان راز مرا

زخود بیگانہ بودن در رہ عشق | بہ آں معشوق طرح آشنائی است

عشق تا در دل آمد نہ در آمد نہ نمود | بادہ پر شور نشد تا کہ بہ مستان نرسید

ان اشعار سے اگرچہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں، لیکن ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت، اور خودداری ان کا خاص حصہ ہے ان مضامین کو ان سے بہتر آج تک کوئی ادا نہ کرسکا، اور چونکہ ان کا قال، حال کی تصویر ہے، اسلئے ایک خاص اثر رکھتا ہے جو ہر شخص کے کلام میں پیدا نہیں ہوسکتا،

دو قرص نان، اگر از گندم است یا از جو | دو تاے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو

بہ چار گوشہ دیوار خود بہ خاطر جمع | کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو

ہزار بار فزون تر بہ نزد ابن یمین | ز فر مملکت کے قباد و کے خسرو

اگر دو گاو بدست آوری و مزرعہ | یکے امیر و یکے راوزیر نام کنی

بداں قدر چو کفاف معاش تو نہ شود | روے و نان جوے از یہود وام کنی

لہ یہ تمام حالات ید بیضا سے اور تذکرۂ دولت شاہ سے لیے گئے ہیں،

هزار بار ازاں بہ کہ از پے خدمت — کمر بہ بندی و بر مرو کے سلام کنی

ز دیوانہ کرد روزے سوال — سلیمان مرسل علیہ السلام
کہ چوں بینی ایں سلطنت کز پدر — مرا ماند با ایں ہمہ احتشام
چہ خوش گفت دیوانہ اورا جواب — کہ چوں نیست ایں مملکت مستدام
پدر مدتے آہن سرد کوفت — تو در باد پیمودنے صبح وشام

حضرت داؤد زرہ بنایا کرتے تھے، اور حضرت سلیمان کی نسبت مشہور ہے کہ اُن کا تخت ہوا پر چلتا تھا، فارسی میں آہن سرد کوفتن، اور باد پیمودن کے معنے بیکار کام کرنے کے ہیں، دیوانہ نے حضرت داؤد کے زرہ بنانے اور حضرت سلیمان کے تخت ہوا پر چلنے کو آہن سرد کوفتن اور بادہ پیمودن سے تعبیر کیا ہے۔

مرد آزادہ درمیان گروہ — گرچہ خوش گوے و عاقل و داناست
محترم آنگہے تواند بود — کہ از ایشان بہ مالش استغناست
واں کہ محتاج خلق شد، خوار است — گرچہ در علم بو علی سیناست

شنیدہ ام کہ یکے عقربے ز خانۂ خویش — بروں روید و ہمے زد ہر آنچہ آمد پیش
بہ پیش آمد سنگے عظیم و بس منکر — بزد بر سنگ و صد نیش تا بگرد و ریش
ز سنگ نعرہ بر آمد کہ خویش رنجہ مدار — کہ ضرب نیش تو مارا نہ کم کند و نہ بیش
جواب دادش و گفتش کہ راست مے گوئی — ولے پدید کند ہر کہ ہست جوہر خویش

شاعری نیست پیشۂ کہ ازاں | رسدت نان ونیز ترہ بہ دروغ
راستی، سخت زشت وبے معنی است | اجرتے خواستن برائے دروغ
زاں بود کار شاعران بے نور | کہ ندارد چراغ کذب فروغ

قناعت اور توکل کے ساتھ، یہ نکتہ بھی ابن یمین کے ذہن نشین ہے کہ زر کے بغیر اطمینان نہیں حاصل ہوتا، چنانچہ فرماتے ہیں،

لالہ را گفتم اے پری پیکر | سیرتت خوب وصورتت نیکوست
راست گو ایں سیہ دلی از چیست | گرت زحمتے رسید از دوست
گفت زیرا کہ من ندارم زر | زر کہ اسباب شادکامی ازوست
غنچہ را بین کہ خردہ دارد | مے نہ گنجد زخرمی درپوست

کبھی کبھی فلسفہ کہہ جاتے ہیں،

زوم از کتم عدم خیمہ بہ صحرائے وجود | از جمادے بہ نباتے سفرے کردم ورفت
بعد ازانم کشش نفس، بہ حیوانی برد | چوں رسیدم بوے از وے گزرے کردم ورفت
بعد ازاں در صدف سینۂ انسان بہ صفا | قطرۂ مستی خود را گہرے کردم ورفت
بالائک پس ازاں صومعۂ قدسی را | گرد برگشتم ونیکو نظرے کردم ورفت

بعد ازاں رہ سئے او بردم وچوں ابن یمین
ہمہ او گشتم وترک دگرے کردم ورفت

غلام نقشبند کاتب ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ

تصنیفات مولانا شبلی نعمانی مرحوم

شعر العجم حصّہ اوّل - فارسی شاعری کی ابتدا عباس مروزی سے نظامی تک قیمت ۳ے

شعر العجم حصّہ دوم - شعرائے متوسطین (خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک
کے تذکرے اور اُن کے کلام پر رائے . . . . قیمت عہ

شعر العجم حصّہ سوم - شعرائے متاخرین (فغانی سے کلیم تک) کے تذکرے اور اُنکے کلام پر ریویو - عہ

شعر العجم حصّہ چہارم - شاعری کی حقیقت اور فارسی شاعری کے محاسن اور اس کے مختلف
اصناف میں سے مثنوی پر تبصرہ . . . . قیمت عہ

شعر العجم حصّہ پنجم - قصیدہ، غزل فلسفیانہ، عاشقانہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر نقد و تبصرہ قیمت عہ

موازنۂ انیس و دبیر - مولانا کی لاجواب تالیف جس میں اُنہوں نے آسمان مراثی کے آفتاب و ماہتاب
میر انیس اور مرزا دبیر کے کمالات شاعری کا باہم گرموازنہ کر کے دکھایا ہے - قیمت ۳ے

الفاروق - حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی قیمت عہ قسم دوم عہ

المامون - مامون الرشید کی سوانح عمری . . . . قیمت عہ

علم الکلام - جس میں علم کلام کی ابتدا اور اس کے عہد بعہد کی وسعت، ترقی اور تغیرات کی نہایت
تفصیلی تاریخ اور علم کلام کے تمام شعبوں پر محققانہ بحث اور اس کی مختلف شاخوں
پر تبصرہ مطبوعہ معارف پریس . . . . قیمت عہ

الکلام یعنی علم کلام جدید جس میں اسلام کے عقائد کو فلسفہ حال کے مقابلہ میں ثابت کیا گیا ہے مطبوعہ معارف پریس عہ

ملنے کا پتہ
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور